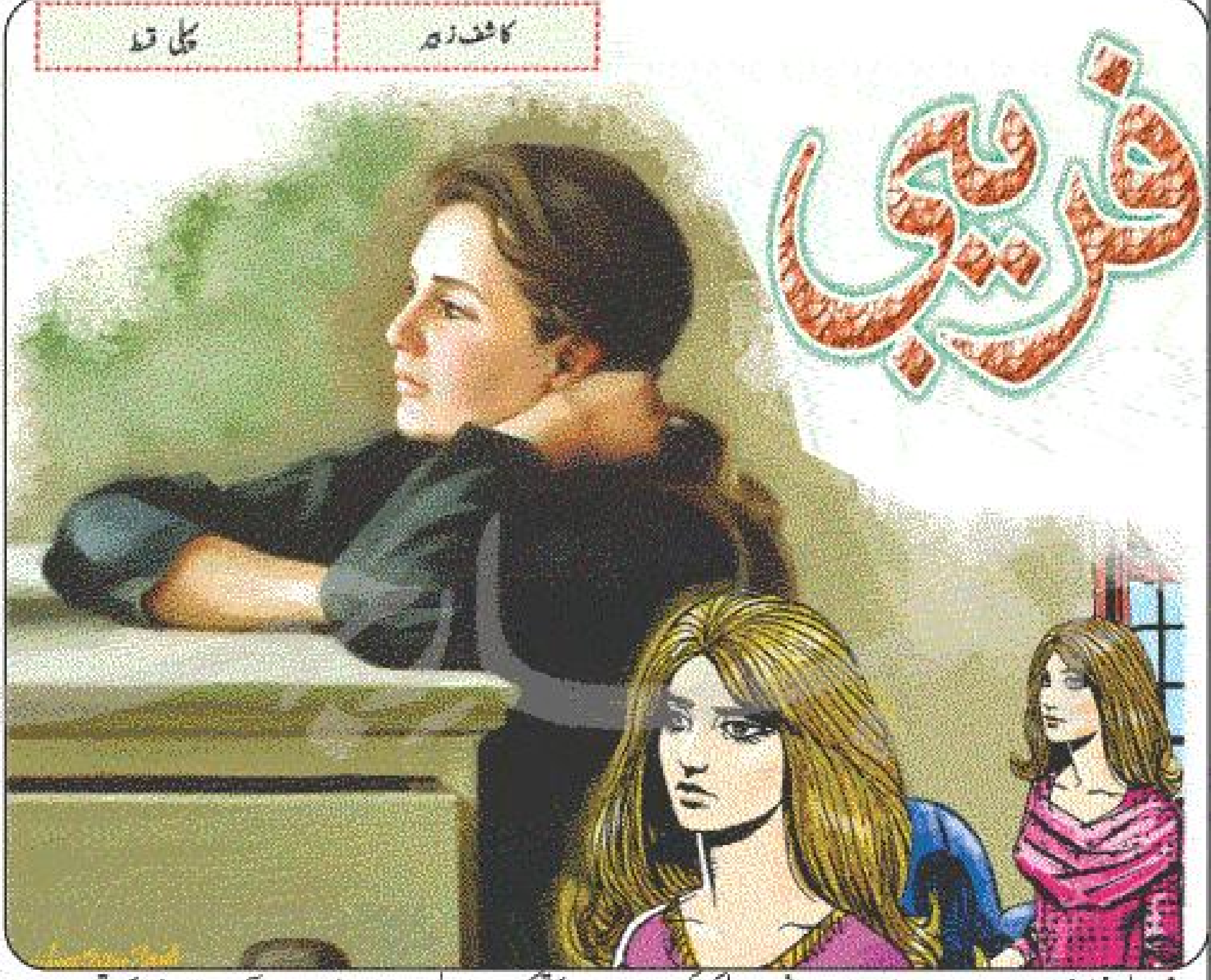
ڈی ایس پی محمود علی کو کرائم برانچ میں منتقل ہوئے صرف ایک ہفتہ گزرا تھا۔ آج اسے کمرہ ملا تھا۔ ہیڈ کوارٹر میں تعیناتی کو سزا یا جزاء سے موسوم کیا جاتا تھا۔ راشی اور بدعنوان افسران کے لئے یہ سزا تھی تو حلال پر یقین رکھنے والے افسران کے لئے جزاء..... محمود علی اس سے پہلے جس تھانے میں تھا، اسے شہر کا زرخیز ترین تھانہ قرار دیا جاتا تھا لیکن جب تک محمود علی وہاں ایس ایچ او رہا، تھانے میں خشک سالی کا دور دورہ تھا۔



محمود علی نچلے عملے پر بے جا پابندیاں لگانے کا عادی نہیں تھا لیکن کسی معاملے میں کوتاہی بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ ایک ناکام چھاپے کی کارروائی کو بہانہ بنا کر اعلیٰ افسران نے اس کا تبادلہ کرائم برانچ میں کروا دیا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کی آمدنی کے سوتے بھی خشک ہوگئے تھے۔

کرائم برانچ کو مردہ کیسز کا قبرستان بھی کہا جاتا تھا کیونکہ یہاں آنے والوں کے لئے پرانے کیسز ہی رہ جاتے تھے جنہیں پولیس ناقابل حل قرار دے کر داخل دفتر کی کارروائی کے لئے بھیج دیتی تھی۔

محمود علی پڑھے لکھے گھرانے کا فرد تھا۔ اس کے والد جسٹس محمد علی عمل پیہم پر یقین رکھتے تھے، ان کے عدالتی فیصلے مقبول تھے اور وہ فیصلہ کرتے ہوئے کوئی سفارش یا دباؤ قبول نہیں کرتے تھے۔ محمود علی کا بڑا بھائی محمود علی سول سروس میں تھا۔ محمود علی نے ایل ایل بی کے بعد پولیس جوائن کرلی، اعلیٰ تعلیمی اور خاندانی پس منظر کی وجہ سے اے ایس آئی کی پوسٹ ملی تھی۔ اس نے تفتیش کے معاملے میں پولیس کے روایتی طریقۂ کار سے انحراف کرتے ہوئے سائنٹفک انداز اپنایا تھا۔ اس نے کئی ایسے کیسز حل کیے جنہیں ناقابل حل قرار دے کر داخل دفتر کیا جاچکا تھا، کئی معمہ نظر آنے والے کیسز اس نے اس طرح سلجھائے تھے کہ افسران بھی حیران رہ گئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ چھ سال کے عرصے میں اس نے ڈی ایس پی کی پوسٹ حاصل کرلی تھی۔ وہ بگڑے نظام سے مایوس نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ لگن سے کام کرتا رہا تو خدا اس کے لئے راستے نکالتا رہے گا۔

محمود علی پہلی بار کرائم برانچ نہیں آیا تھا، اس سے پہلے بھی دو بار اس کا تبادلہ یہاں ہوچکا تھا لیکن وہ اپنی اچھی کارکردگی کے باعث جلد ہی اوپر والوں کی گڈ بک میں آجاتا تھا اور جب کسی تھانے کے معاملات زیادہ ہی بگڑ جاتے تھے تو اسے ایس ایچ او بنا کر وہاں بھیج دیا جاتا تھا۔

اس کے بے داغ کردار سے اس کے افسران شاکی رہتے تھے تو اس کے ساتھی اس سے خار کھاتے تھے۔ کالی بھیڑوں میں وہ سفید بھیڑ بن کر ہمیشہ نمایاں ہوجاتا تھا۔ میڈیا بھی اسے کوریج دیتا تھا۔ اس بات نے اس کے کئی حاسد پیدا کردیے تھے۔

اس بار وہ برانچ ہیڈ کوارٹر آیا تو اسے کمرہ حاصل کرنے کے لئے خاصی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ اس کی مسلسل درخواستوں سے تنگ آکر اسے ریکارڈ روم کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ دے دیا گیا تھا۔ اس نے اس پر بھی شکر ادا کیا ورنہ وہ برآمدے میں بیٹھ کر کام کر رہا تھا۔

اس کے پاس فی الوقت کوئی کیس نہیں تھا، اسی لئے اس نے ریکارڈ روم دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ صبح سویرے اس نے آکر فائلوں کو دیکھنا شروع کیا۔ اس کی توجہ کا مرکز معاشرتی جرائم تھے، ایک فائل اسے دلچسپ لگی، یہ کچھ لوگوں کا گروہ تھا جو شادی کے نام پر فراڈ کر رہے تھے، اس سے پہلے انسپکٹر سبحان ربانی نے اس کیس پر کام کیا تھا، اس نے بڑی محنت سے تفتیش کرکے کیس کی کڑیاں ملائی تھیں اور ثبوت جمع کیے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جرم کرنے والے غائب تھے، وہ اتنی مہارت سے جرم کرتے تھے کہ ایک بار بھی ان میں سے کسی کی شناخت سامنے نہیں آئی تھی، اس لئے اتنی محنت کے بعد بھی کیس کی گاڑی یہاں آکر ٹھپ ہوگئی تھی۔ فائل نکلوا کر وہ اپنے کمرے میں آیا اور چپراسی کو چائے لانے کا کہا۔ چائے آتے ہی وہ فائل کے مطالعے میں گم ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

عذرا رحمان کی دو بیٹیاں تھیں۔ مصباح رحمان اور سدرہ رحمان.....

وہ ایک کالج میں لیکچرار تھیں، شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے ان بچیوں کو پالا تھا۔ رحمان علی دفتر سے آتے ہوئے ایک حادثے کا شکار ہوکر دنیا سے چل بسے تھے۔ اس وقت مصباح اور سدرہ نو اور سات سال کی تھیں۔ شوہر سے جدائی کو عذرا نے بڑی استقامت سے برداشت کیا، وہی اب اس خاندان کی سربراہ تھیں۔ رحمان علی اچھی نجی ملازمت میں تھے۔ انہوں نے گلشن اقبال میں دو سو گز کے پلاٹ پر گھر بھی بنالیا تھا، گاڑی بھی تھی لیکن ان کے انتقال کے بعد عذرا پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے کچھ جمع نہیں کیا تھا، جو کمایا تھا، اس سے مکان بنوالیا تھا اور کھا پی کر خرچ کردیا تھا۔ خود عذرا کو بھی بچت کرنے کا خیال نہیں آیا، شوہر کے وفات پانے کے بعد وہ خالی ہاتھ تھیں، لے دے کر بینک میں چند ہزار روپے پڑے تھے یا ان کے پاس دس گیارہ تولے کا زیور تھا۔ گاڑی حادثے میں بری طرح تباہ ہوگئی تھی اس لئے عذرا کو اسے کباڑی کے ہاتھ بیچنا پڑا، ڈیڑھ پونے دو لاکھ کی گاڑی کے صرف چالیس ہزار ملے تھے۔

عذرا شادی سے پہلے بی ایڈ کرچکی تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے ایم اے کیا۔ اپنی تعلیمی قابلیت کی بنیاد پر انہوں نے کالج میں لیکچرار کی اسامی کے لئے درخواست دے دی۔ رحمان علی کے ایک رشتے کے چچا ایجوکیشن کے محکمے میں اعلیٰ افسر تھے اسی لئے ان کی کوشش سے عذرا کو جاب مل گئی، یوں گھر کی گاڑی چلنے لگی۔ دونوں بچیاں ایک مہنگے اسکول میں پڑھتی تھیں جہاں کی فیسیں اب عذرا کے لئے ناقابل برداشت تھیں، اس لئے انہوں نے بیٹیوں کو وہاں سے اٹھا کر ایک نسبتاً سستے اسکول میں داخل کرادیا۔ زندگی کا سفر ذرا وقت سے سہی لیکن چلنے لگا تھا۔

عذرا جانتی تھیں کہ صرف زندگی کے تقاضے پورے ہونا ضروری نہیں ہیں بلکہ آنے والے وقت کے لئے ان کے ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے۔ جب مصباح اور سدرہ جوان ہوں گی اور ان کی شادی کا مسئلہ ہوگا، اس کے لئے انہوں نے شام کے وقت گھر میں ٹیوشنز پڑھانی شروع کردی۔ گھر میں پانچ کمرے تھے جو ان کی ضرورت سے زیادہ تھے اس لئے انہوں نے باہر والے بڑے کمرے میں ٹیوشن سینٹر کھول لیا، رفتہ رفتہ ٹیوشن سینٹر بھی چل نکلا، اضافی آمدنی کو عذرا نے خرچ کرنے کے بجائے کمیٹیوں کی مدد سے جمع کرنا شروع کردیا، جب کچھ رقم جمع ہوئی تو انہوں نے اوپر کمرے بنوانا شروع کردیے۔ جس وقت مصباح میٹرک کا امتحان دے رہی تھی، عذرا نے اوپر والے حصے میں تین کمرے اور ایک لاؤنج بنوالیا تھا، وہ اوپر چلے گئے، ٹیوشن سینٹر بھی اوپر منتقل کردیا اور مکان کا نچلا حصہ کرائے پر اٹھادیا۔ یہ پوش علاقہ تھا اس لئے عذرا کو کرائے کی صورت میں معقول آمدنی ہونے لگی، زندگی اب نسبتاً آسانی سے بسر ہونے لگی تھی۔

عذرا نے تنگی ترشی کے باوجود اپنی بچیوں کو کوئی کمی نہیں ہونے دی تھی۔ ان کا کھانا، پینا اور لباس ویسا ہی رہا جیسا باپ کی زندگی میں تھا، اسکول کا معیار کم ہوگیا تھا لیکن اس کی کسر انہوں نے اپنی توجہ سے پوری کردی تھی۔

دوپہر کو تھکی ہاری کالج سے آنے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کیا کرتی تھیں۔ انہوں نے مصباح اور سدرہ کی تربیت اس طرح کی تھی کہ وہ خاصی کم عمری میں گھر سنبھالنے لگی تھیں، اسکول جانے کی تیاری وہ رات کو کیا کرتی تھیں، صبح سدرہ ناشتہ تیار کرتی تھی اور مصباح دوپہر کا کھانا۔ پھر اسکول سے آکے وہ چاول یا چپاتی بنالیا کرتی تھی، چار بجے ٹیوشن سینٹر میں بچے آنے لگتے تھے۔ عذرا نے شروع سے یہ اصول اپنا رکھا تھا کہ ہر بچے پر انفرادی توجہ دی جائے، اس وجہ سے انہوں نے بچے کم رکھے تھے اور فیس زیادہ لیتی تھیں، ان کے پاس ٹیوشن کے لئے آنے والے بچے عام طور سے اسکولوں میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے تھے اس لئے والدین بخوشی زیادہ فیس دیا کرتے تھے۔ چار سے آٹھ بجے تک وہ ٹیوشن پڑھاتی تھیں، اب انہوں نے ٹیوشن سینٹر دوسری منزل پر ایک بڑا کمرہ بنوا کر وہاں منتقل کردیا تھا، ٹیوشن والے کمرے کو انہوں نے ڈرائنگ روم بنالیا تھا۔ بیٹیوں کی ماں ہونے کے ناتے انہیں احساس تھا کہ انہیں لوگوں سے تعلقات بنا کر رکھنے چاہئیں، آنا جانا ہوتا رہے تب ہی لڑکیاں نظروں میں آتی ہیں اور ان کے رشتے آتے ہیں۔ لوگ اب سیرت سے زیادہ صورت اور شرافت سے زیادہ گھر کا سامان دیکھتے ہیں اس لئے انہوں نے ایک عمر سادگی سے گزارنے کے بعد اپنا گھر بھی اچھی طرح ڈیکوریٹ کرلیا تھا۔

مصباح نے میٹرک کرکے کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اس کی عمر سولہ سال تھی لیکن وہ دیکھنے میں اپنی عمر سے بڑی لگتی تھی۔ اس نے ایسا قد و قامت اور رنگ و روپ نکالا تھا کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے۔ عذرا ابھی اس کے تیزی سے بڑھتے ہوئے وجود کو فکرمندی سے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کے لئے جہیز جوڑنا شروع کردیا تھا، ان کی تنخواہ بھی ترقی کے بعد معقول ہوگئی تھی۔ ٹیوشنوں اور مکان کے کرائے کو وہ جمع کرتی تھیں، اس سے کمیٹیاں ڈال کر انہوں نے دونوں لڑکیوں کے زیور اور چھوٹا موٹا سامان جمع کرلیا تھا، باقی کے لئے وہ پرامید تھیں کہ جب تک مصباح کی شادی کا وقت آئے گا تو مزید ہوجائے گا۔

پہلے ان کا خیال تھا کہ مصباح کی شادی گریجویشن کے بعد کریں گی لیکن اب ان کا خیال بدل گیا تھا۔ انہوں نے سوچا اب انٹر کے دوران کوئی معقول رشتہ آیا تو وہ اس کی شادی کردیں گی۔ سدرہ ابھی پڑھ رہی تھی۔ مصباح کی ذمے داری سے سبکدوش ہوکر وہ اس کی شادی آرام سے بھی کرسکتی تھیں۔ یہ بات انہوں نے اپنے جاننے والوں کو بتانا شروع کردی تھی کہ مصباح کا کوئی اچھا رشتہ آگیا تو وہ کم عمری کے باوجود اس کی شادی کردیں گی۔ مصباح شکل و صورت کی پیاری تھی، عادات کی اچھی تھی، اسے نعت خوانی کا شوق تھا، آواز اچھی تھی اسی لئے اسے اکثر میلاد شریف کی محفلوں میں بلایا جاتا تھا۔ وہیں ڈاکٹر نسیم کی والدہ نے اسے پسند کرلیا۔ اس کی جسامت دیکھ کر وہ سمجھیں کہ مصباح بیس سال کی ہے، ان کا بیٹا ڈاکٹر نسیم ستائیس برس کا تھا، اچھا خوش شکل اور شریف نوجوان تھا، ایم بی بی ایس اور ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد وہ ایک نجی اسپتال میں کام کر رہا تھا اور اپنا کلینک بھی چلا رہا تھا جو اس نے اپنے گھر کے نچلے حصے میں قائم کر رکھا تھا۔ عذرا اس سے واقف تھیں۔ ڈاکٹر نسیم کا کلینک اور رہائش قریب ہی تھی، وہ کئی بار چھوٹی موٹی تکالیف کے سلسلے میں اس کے کلینک جاچکی تھیں۔

ڈاکٹر نسیم کی والدہ رشتہ لے کر آئیں تو عذرا بے حد خوش ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نسیم کی شرافت کا سارا محلہ گواہ تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا، باپ ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے، ایک بہن تھی جو بیاہ کر اپنے گھر کو جاچکی تھی، ان لوگوں کا اپنا مکان تھا۔

ڈاکٹر نسیم صبح سے دوپہر تک اسپتال میں جاب کرتا تھا اور شام کے وقت اپنا کلینک چلاتا تھا، اس کی آمدنی بھی معقول تھی اسی لئے اقرار نہ کرنے کے باوجود عذرا نے اپنے انداز سے واضح کیا کہ انہیں یہ رشتہ پسند تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر نسیم کی والدہ یہ جان کر ذرا مایوس ہوئی تھیں کہ مصباح کی عمر صرف سترہ برس تھی، یعنی ان کے بیٹے سے پورے دس برس چھوٹی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ عذرا شاید نہ مانیں لیکن ان کا رد عمل بھی حوصلہ افزا رہا تھا۔

عذرا نے اپنے خاندان والوں کو بلا کر اس رشتے کا ذکر کیا۔ تب انہیں پہلی بار معلوم ہوا کہ ان کی مصباح کے کتنے ہی امیدوار خاندان میں موجود تھے۔ مصباح کے دونوں چچا اسے اپنے لڑکوں کے لئے مانگنا چاہتے تھے، عذرا کی واحد بہن بھی مصباح کا رشتہ اپنے بیٹے سے کرنا چاہتی تھیں۔ عذرا پریشان ہوگئیں۔ انہوں نے مشورے کے لئے خاندان والوں کو اکٹھا کیا تھا کہ انہوں نے مصباح کے رشتے کے لئے آپس میں جھگڑا شروع کردیا۔ عذرا بولیں۔ ”خدا کے لئے آپس میں مت جھگڑیں، مجھے اس رشتے کے بارے میں بتائیں۔“

”انکار کردو۔“ تینوں نے یک آواز ہوکر کہا تھا۔

”مگر کیوں؟“ عذرا حیرانی سے بولیں۔ ”لڑکا اچھا ہے، ڈاکٹر ہے..... اپنا گھر ہے..... اچھی آمدنی ہے پھر انکار کی وجہ؟“

”وہ غیر خاندان کا لڑکا ہے۔“ مصباح کے بڑے چچا بولے۔

”یہ کوئی وجہ نہیں ہے، میں اور رحمان ایک خاندان کے نہیں تھے پھر بھی ہماری شادی ہوئی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولیں۔ ”آپ انصاف کی بات کریں، اپنے بیٹوں کا موازنہ اس رشتے سے کریں اور پھر مجھے مشورہ دیں۔“

”ہم کیا مشورہ دیں، جب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے۔“ عذرا کی بہن ناراض ہوکر بولیں۔ ”اب اپنی مرضی سے ہاں بھی کردو۔“

مصباح کی خالہ اور چچا ناراض ہوکر چلے گئے۔ عذرا اب تک حالات کا اکیلے مقابلہ کرتی آئی تھیں۔ رحمان علی کے انتقال کے بعد بہن اور مصباح کے خاندان والوں نے زبانی ہمدردی تو کی تھی لیکن عملی مدد کے لئے کوئی آگے نہیں آیا تھا، انہوں نے خود ہی ہمت کی اور اپنی بچیوں کو اس مقام تک پہنچایا تھا، اب یہ ان کے دعویدار بن کر آگئے تھے۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھیں کہ ان لوگوں کی نظریں ان کے مکان پر مرکوز تھیں۔

رحمان علی نے سستے وقتوں میں یہ جگہ لے کر مکان بنوایا تھا۔ اب یہاں صرف دو سو گز کا پلاٹ ہی پچیس لاکھ سے کم نہیں تھا۔ ان چچاؤں اور خالہ کی نظر اس مکان پر تھی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بیٹی کا رشتہ بھی اپنے بل بوتے پر کریں گی۔

اگلی بار جب ڈاکٹر نسیم کی والدہ آئیں تو انہوں نے رضامندی دیدی لیکن یہ بھی کہا کہ شادی وہ اس وقت کریں گی جب مصباح انٹر کرلے گی۔ ڈاکٹر نسیم کی والدہ راضی ہوگئیں۔ ایک سال کا تو عرصہ تھا، شادی کے لئے اتنا وقت تو چاہئے تھا، ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی، وہ اس میں سارے ارمان نکالنا چاہتی تھیں۔

مصباح اس معاملے میں بالکل سیدھی اور ماں پر اعتماد کرنے والی لڑکی تھی۔ اس نے بلا جھجک ماں کی پسند پر سر جھکا دیا تھا، البتہ اس سے چھوٹی سدرہ نے اس بات پر ماں سے کہا تھا کہ ڈاکٹر نسیم عمر میں مصباح سے پورے دس سال بڑا ہے۔ ماں نے اسے رسانیت سے سمجھا دیا تھا کہ عمروں کا یہ فرق زیادہ نہیں ہے، خود رحمان علی، عذرا سے پورے نو سال بڑے تھے، وہ صرف انیس برس کی تھی جب رحمان سے ان کی شادی ہوئی تھی اور اگلے برس مصباح ان کی گود میں آئی تھی۔ انہیں تعلیم کا شوق تھا، شادی سے چند دن قبل وہ بی ایڈ کے پیپرز دے کر فارغ ہوئی تھیں۔

پھر مصباح اور سدرہ کے درمیان وقفے میں انہوں نے ایم اے کے پرچے دیے تھے، اس وقت وہ صرف سینتیس برس کی تھیں لیکن ذمے داریوں نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ جسم پھیل گیا تھا اور وہ باقاعدہ ادھیڑ عمر کی نظر آنے لگی تھیں، اگر خود کو سنبھال کر رکھتیں تو شاید اپنی عمر سے کم ہی نظر آتیں مگر بیوگی کے بعد انہوں نے جان بوجھ کر اپنے اوپر توجہ دینا بند کردی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر کوئی بیوہ حسین اور جوان نظر آئے تو لوگ کسی نہ کسی بہانے اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں، وہ وقت سے پہلے عمر رسیدہ نظر آنے لگی تھیں۔

اگرچہ عذرا رحمان نے بہت کچھ جوڑ رکھا تھا اور ابھی ایک سال درمیان میں تھا۔ ان کے پاس کچھ رقم تھی مگر مصباح کی باعزت رخصتی کے لئے انہیں اور رقم چاہئے تھی، ان کی ملازمت کو ابھی آٹھ سال ہی ہوئے تھے، اس لئے ان کے پراویڈنٹ فنڈ میں بھی زیادہ رقم نہیں تھی، رشتے داروں سے کچھ ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مجبوراً انہوں نے اپنا اور سدرہ کے لئے بنایا جانے والا زیور فروخت کردیا۔ اس کے باوجود کچھ قرض لینا پڑا تھا۔

مصباح کے پیپرز کی مناسبت سے شادی کی تاریخ طے کرلی اور سال بھر میں وہ ایک بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوچکی تھیں۔ سدرہ اس وقت سولہ برس کی تھی اور میٹرک کرچکی تھی۔ عذرا رحمان نے سوچ لیا کہ اس کی شادی چار سال سے پہلے نہیں کریں گی۔ ایک تو سدرہ کو آگے پڑھنے کا شوق تھا اور اس نے ماں سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے گریجویشن سے پہلے اس کی شادی کے بارے میں نہ سوچیں۔ دوسرے وہ مصباح کی طرح خوبصورت بھی نہیں تھی، بس قبول صورت تھی۔ رنگت سانولی تھی اور نین نقش مناسب تھے۔ عذرا رحمان جانتی تھیں کہ اس کا رشتہ اتنی آسانی سے نہیں آئے گا۔

قرض اتارنے اور آگے سدرہ کے جہیز کے لئے جوڑنے کی غرض سے انہوں نے اپنے ٹیوشن سینٹر کو باقاعدہ کوچنگ سینٹر میں بدل دیا اور شام چار سے رات نو بجے تک بڑی کلاسیں بھی لینے لگیں۔ کوچنگ سینٹر صرف لڑکیوں کے لئے تھا۔ عذرا رحمان کی کیونکہ اچھی ساکھ تھی، اسی لئے کوچنگ سینٹر جلد چل نکلا، انہوں نے چھوٹی کلاسوں کو پڑھانے کا کام سدرہ کو سونپ دیا، سائنس اور کامرس کے مضامین پڑھانے کے لئے دو ٹیچرز رکھ لیں، اپنے گھر کی دوسری منزل کو مکمل طور پر کوچنگ سینٹر کے لئے وقف کرکے وہ اوپر چلی گئیں جہاں انہوں نے ایک کمرہ، باتھ روم اور کچن بنوالیا تھا۔

وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ انہیں پتا ہی نہیں چلا چار سال گزر گئے۔ سدرہ نے گریجویشن کرلیا تھا، اس دوران انہوں نے اس کے جہیز کی تقریباً ساری تیاری مکمل کرلی تھی۔

اسی دوران سدرہ کے دو تین رشتے آئے تھے لیکن کوئی ایسا نہیں تھا جو سدرہ کے دل کو بھاتا۔ ساتھ ہی وہ بے حد فکرمند رہنے لگی تھیں۔ یہی تو وقت ہوتا ہے جب لڑکیوں کے رشتے آتے ہیں، یہ عمر گزر جائے تو پھر لڑکیوں کے رشتے آنا بھی دشوار ہوجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے جاننے والوں میں کہہ رکھا تھا، ایک دو بار شادی دفتر والوں سے بھی رجوع کرنے کے بارے میں سوچا لیکن ان کے بارے میں مشہور فراڈ کی کہانیوں کی وجہ سے ہمت نہ ہوئی۔

سدرہ نے گریجویشن کے بعد کوچنگ سینٹر کی ذمے داریاں مکمل طور پر سنبھال لی تھیں۔ عذرا رحمان اب کالج سے آکر آرام کرتیں یا گھر کی ذمے داریاں نمٹایا کرتی تھیں۔

وقت کا پہیہ بے آواز اور غیر محسوس طریقے سے گھومتا رہا اور دو سال مزید گزر گئے، اس وقت تک کوئی معقول رشتہ بھی نہیں آیا تھا۔ اب عذرا اخبارات میں ضرورت رشتہ کے اشتہارات دیکھنے لگی تھیں۔ ایک روز ایک اخبار میں چھپنے والے اشتہار نے ان کی توجہ کھینچ لی تھی۔ اس کا متن کچھ اس طرح تھا۔ 'لاہور سے آئی ایک فیملی کے اکلوتے صاحبزادے کے لئے کسی معقول رشتے کی ضرورت ہے، لڑکی قبول صورت، گریجویٹ اور اچھے خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتی ہو، جہیز کی کوئی شرط نہیں ہے، رجوع فرمائیں۔'

اشتہار کے ساتھ صرف ایک فون نمبر تھا۔ عذرا کو یہ سادہ سا اشتہار بھا گیا۔ سدرہ سو رہی تھی اور اتوار کا دن تھا، انہیں یقین تھا کہ لڑکے والے بھی گھر پر ہوں گے، انہوں نے اسی وقت یہ نمبر گھمایا، دوسری طرف کسی مرد نے ریسیور اٹھایا اور بڑے نستعلیق لہجے میں سلام کیا۔

سلام کا جواب دے کر عذرا بولیں۔ ”میں نے اس اشتہار کے سلسلے میں فون کیا ہے۔ ضرورت رشتہ، اس میں یہ نمبر دیا گیا ہے۔“

”جی محترم خاتون! اشتہار ہم ہی نے دیا ہے، میرا نام شفیع احمد ہے اور میں نور احمد کا باپ ہوں، ہمیں اپنے بچے کے لئے رشتہ درکار ہے، ہم شریف لوگ ہیں، حال ہی میں لاہور سے ترک مکانی کرکے کراچی آئے ہیں، یہاں کسی سے واقفیت نہیں ہے، اس لئے بچے کے رشتے کے لئے اخبار میں اشتہار دیا ہے۔“

عذرا اس کے پختہ لہجے سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ”آپ صاحبزادے کے بارے میں کچھ بتائیں۔“

”نور کپڑے کا کاروبار کرتا ہے، اس نے حال ہی میں ایک شاپنگ سینٹر میں دکان کھولی ہے، اچھا گزارا ہوجاتا ہے، برخوردار نے بی کام کیا ہے، بچپن ہی سے محنتی رہا ہے، تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمتیں بھی کرتا رہا ہے۔“

”اور عمر کتنی ہے؟“

”بی بی! نور کی عمر ستائیس برس ہے، اچھا خوش شکل نوجوان ہے اور میں آپ کو پہلے بتادوں ہم متوسط طبقے کے سادہ لوگ ہیں اور سادہ سی زندگی بسر کرتے ہیں، ایف بی ایریا کے ایک کرائے کے فلیٹ میں گزارا کرتے ہیں، یہ سب آپ دیکھ لیں، لڑکے کو دیکھ لیں، اگر آپ کا دل کرتا ہے تو بسم اللہ۔“

عذرا اس بار زیادہ متاثر ہوئی تھیں۔ لوگ تو رشتوں میں جھوٹ کی ایسی دیوار کھڑی کردیتے ہیں کہ حقائق جاننا دشوار ہوجاتا ہے اور یہ صاحب پہلے ہی صاف لفظوں میں اپنے بارے میں بتا رہے تھے۔

وہ بولیں۔ ”بھائی صاحب! پیسہ تو آنی جانی شے ہے، انسان کا کردار ہی اصل چیز ہوتی ہے، صاحبزادے کے علاوہ اور آپ کے گھر میں کتنے لوگ ہیں؟“

”بس میری ایک بیوی ہے، روحانی طور پر اللہ میاں کی گائے ہے، اس کا زیادہ وقت عبادات میں صرف ہوتا ہے، ہم تین ہی افراد ہیں، آپ ان سے مل کر خوش ہوں گی۔“

”مجھے اپنا پتا نوٹ کرائیے۔“

”جی ضرور۔“ مرد نے خوش دلی سے کہا۔ اس نے شاہراہِ پاکستان پر ایک کمپلیکس کا پتا بتایا۔ اس کمپلیکس کے بیشتر فلیٹ خالی پڑے تھے۔ اتفاق سے عذرا کا اس طرف جانا ہوا تھا اس لئے وہ علاقے کو جانتی تھیں۔ فون کرنے سے پہلے انہیں خیال آیا۔

”صاحبزادے کی شاپ کہاں ہے؟“

”شاپ یونیورسٹی روڈ کے ایک شاپنگ مال میں ہے۔“ مرد نے دکان کا پتا بھی نوٹ کرا دیا۔ ”بس ابھی کام کا آغاز ہے، اللہ آہستہ آہستہ برکت بھی دے گا۔“

”انشاء اللہ!“ عذرا بولیں۔ ”بھائی صاحب! اگر میں اگلے اتوار کو آجاؤں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”کیسی باتیں کرتی ہیں، بہن...... ! خوشی سے آئیں، آپ کے اپنے بھائی کا گھر ہے، رشتے ناتے تو آسمانوں پر طے ہوتے ہیں لیکن آپ سے ذرا بات کر کے ایسی انسیت محسوس ہونے لگی ہے جیسے سگی بہن ہوں۔“

اسی دوران میں نور احمد کی والدہ بھی آگئیں۔ ان سے بات کر کے عذرا کو اندازہ ہوا کہ وہ دنیا کے مکر و فریب سے نا آشنا بالکل سادہ سی گھریلو خاتون ہیں۔ فون بند کر کے وہ بے حد خوش تھیں۔ انہیں لگا جیسے یہ رشتہ ان کے لئے ہی بنا ہے۔ سدرہ کی شادی کی فکر نے ان کو ہائی بلڈ پریشر کا مریض بنا دیا تھا، راتوں کو انہیں نیند نہیں آتی تھی، اس رات وہ سکون سے سوئی تھیں۔

☆......☆......☆

عذرا نے گزشتہ تجربے کی روشنی میں خاندان والوں سے اس رشتے کا ذکر نہیں کیا۔ اس مرتبہ انہوں نے اپنی کولیگ رخسانہ ریاض سے بات کی اور ان سے درخواست کی کہ ان کے ساتھ لڑکے کے گھر چلیں۔ رخسانہ خوشی سے راضی ہوگئیں۔

اگلے اتوار کو عذرا، سدرہ کو یہ بتا کر گھر سے نکلیں کہ وہ ایک جاننے والی خاتون کے ہاں جا رہی ہیں۔ ابھی وہ سدرہ کو اس بارے میں نہیں بتانا چاہتی تھیں۔ رخسانہ بھی ایف بی ایریا میں ہی رہتی تھیں۔ عذرا پہلے ان کے گھر گئیں، دوپہر کا کھانا ان کے ہاں کھا کر وہ سہ پہر کے وقت شفیع احمد کے ہاں جانے کے لئے نکلیں۔ رخسانہ کے میاں کے پاس کار تھی اور انہیں ڈرائیونگ بھی آتی تھی اسی لئے وہ کار میں گئے، مطلوبہ پتا تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔

کمپلیکس کے اکثر فلیٹ خالی پڑے تھے۔ جس فلور پر شفیع احمد کا فلیٹ تھا، اس فلور کے سارے ہی فلیٹ خالی پڑے تھے۔ گھنٹی بجانے پر اندر سے ایک طویل قامت اور صحت مند شخص نکلا، اس کی عمر پچپن کے آس پاس تھی لیکن دیکھنے میں خاصا کم عمر لگتا تھا، اگر اس کے چہرے پر سفید داڑھی نہ ہوتی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھا۔

”میں شفیع احمد اور ان کی بیگم سے ملنے آئی ہوں۔“ عذرا رحمان نے اپنا تعارف کرایا تو بوڑھے کے انداز میں گرمجوشی آگئی تھی۔

”ارے بہن...... ! اندر آیئے...... باہر کیوں کھڑی ہیں، میں ہی شفیع احمد ہوں۔“

عذرا اندر گئیں۔ یہ تین کمروں کا نسبتاً کشادہ فلیٹ تھا، داخل ہونے والے راستے کے سامنے کچن تھا، جدید طرز کے اس کچن میں اوون لگا ہوا تھا، دروازے کے سامنے جدید طرز کا بڑے سائز کا فریج تھا، فرش پر وال ٹو وال کارپٹ تھا، سامنے دیوار پر طغرے لگے تھے۔

گیلری میں پہلا کمرہ ہی ڈرائنگ روم تھا جس میں سادہ سے صوفے تھے۔ فرش پر دبیز قالین تھا، اس سے ہم رنگ پردے تھے، یہاں بھی دیواروں پر طغرے لگے ہوئے تھے۔

بالکونی میں کھلنے والی دیوار پر اسپلٹ اے سی لگا تھا لیکن اس موسم میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اکتوبر کے آخر تک کراچی میں بھی موسم خوشگوار ہو جاتا تھا۔ گھر بے حد صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا تھا۔

شفیع احمد نے ان سے کہا۔ ”آپ لوگ بیٹھیں، میں بیگم کو بھیجتا ہوں۔“

شفیع چلا گیا تو رخسانہ نے آہستہ سے کہا تھا۔ ”لوگ تو اچھے لگ رہے ہیں...... سادہ سے...... گھر میں ضرورت کی ہر شے موجود ہے۔“

نشست گاہ میں ایک طرف ریک میں کتابیں سجی تھیں جن میں زیادہ تر مذہب سے متعلق تھیں۔

”خاصے مذہبی لوگ لگتے ہیں۔“ عذرا بولیں۔

اس دوران میں ایک معمر خاتون ہاتھ میں ٹرے لئے اندر داخل ہوئیں۔ ٹرے پر رکھے گلاسوں میں اورنج جوس تھا۔ عذرا ان سے گلے ملیں۔

”میں شفیع صاحب کی بیوی ہوں۔“ خاتون نے سادگی سے تعارف کرایا۔ ”آپ ٹھنڈا لیں۔“

ذرا دیر میں خاتون ان سے بے تکلف ہوگئی تھیں۔ وہ دھیمے لہجے اور سادہ انداز میں بات کر رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ انہیں بتاتی رہیں کہ وہ پہلے لاہور کے ایک علاقے دھرم پورہ میں رہتے تھے، وہاں خاندان والوں سے ایسے تنازعات ہوئے کہ لاہور چھوڑ کر کراچی چلے آئے، وہ لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے والے لوگ تھے، نور کی وجہ سے انہوں نے بہتر سمجھا کہ شہر ہی چھوڑ دیں۔

”ہمارا ایک ہی بچہ ہے...... ہماری آنکھوں کا نور...... اس پر ہم ذرا سی آنچ برداشت نہیں کر سکتے، اپنا بھرا پرا گھر چھوڑ کر چلے آئے۔ بس ضرورت کا سامان لیا تھا، ہمارا مکان بھی وہیں ہے، اسے بیچنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ ادھر اپنا مکان لے سکیں۔“

”آپ کا ارادہ اب کراچی میں رہنے کا ہے؟“

”ہمارا کیا ارادہ، بہن!“ خاتون نے سرد آہ بھری۔ ”اپنی زندگی گزر چکی ہے، اب بچے کی زندگی ہے، اسے کراچی پسند ہے، یہاں اس نے کاروبار بھی شروع کیا ہے، اللہ برکت دے، بس اب ہم اس کی خوشیاں دیکھنے کے لئے زندہ ہیں۔“

”اللہ آپ کو ساری خوشیاں دکھائے۔“ عذرا نے خلوص دل سے کہا۔ انہیں زیادہ خوشی ہو رہی تھی کہ لڑکا مستقل کراچی میں رہنا چاہتا تھا۔ اس دوران جب وہ باتیں کر رہے تھے، شفیع احمد ٹی ٹرالی دھکیلتا اندر آیا۔ اس پر چائے دانی کے ساتھ خاصے لوازمات تھے، سموسے، پکوڑے، نمکو، چپس، کیک اور ڈرائی فروٹ...... عذرا شرمندہ ہوگئیں۔

”آپ نے خاصا تکلف کر لیا۔“

”آپ تو خاص ہیں...... لوگ تو عام طور سے اتنا تکلف کر لیتے ہیں۔“ بیگم شفیع بولیں پھر اصرار کر کے انہیں سب چیزیں کھلانے لگیں۔ شفیع احمد ناشتہ رکھ کر چلے گئے تھے۔ وہ بلا ضرورت خواتین میں بیٹھنے والے انہیں لگ رہے تھے۔

خاطر تواضع کے دوران عذرا نے پوچھا۔ ”کیا صاحبزادے بھی مل جائیں گے؟“

خاتون پہلی بار ہنسیں۔ ”آپ آہی گئی ہیں تو اس سے مل کر جائیں، تصویریں بھی لے لیجئے گا، آج اتوار ہے نا اس کی شاپ بند ہوتی ہے۔“

خاتون اٹھ کر اندر گئی تھیں۔ ذرا دیر بعد ان کے ساتھ ایک خوش شکل نوجوان اندر آیا۔ شاید وہ دیر تک سوتا رہا تھا اس لئے آنکھیں ہلکی سی سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ادب سے سلام کیا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ عذرا اس سے باتیں کرنے لگیں، وہ نارمل انداز میں جواب دیتا رہا۔ اس کا ارادہ اپنے کاروبار کو آگے بڑھانے کا تھا۔ یہ بتاتے ہوئے وہ ذرا جھجک گیا تھا۔ عذرا نے اندازہ لگایا کہ کاروبار کے لئے اس کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی۔ پندرہ بیس منٹ بات کر کے وہ ان سے اجازت لے کر اٹھ گیا۔

اتنی سی دیر میں عذرا نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ مہذب اور سمجھدار نوجوان تھا۔ لہجہ پڑھے لکھوں اور باذوق افراد کا سا تھا۔ مجموعی طور پر عذرا کو یہ گھرانہ اور اس کا ماحول پسند آیا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ زیادہ پیسے والے نہیں تھے، اپنا مکان اور شہر چھوڑ کر آنے سے وہ مالی مشکلات کا شکار تھے۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے بیگم شفیع کو دعوت دی۔

”بہن! آپ بھی ہمارے یہاں آیئے گا۔“

”ضرور...... ! آپ نے دعوت دی ہے تو ضرور آؤں گی۔“ وہ بولیں اور ایک لفافہ انہیں دے دیا۔ ”اس میں نور کی تصویریں ہیں، آپ صاحبزادی کو بھی دکھا دیجئے گا۔“

”میں اسے بھی دکھا دوں گی لیکن میری بچی بہت سعادت مند ہے...... میں جہاں چاہوں گی، وہ ہاں کر دے گی۔“

”بچیاں ساری سعادت مند ہوتی ہیں۔“ بیگم شفیع نے سادگی سے کہا۔ ”لیکن بہتر ہوگا آپ صاحبزادی کی رضامندی بھی لے لیں، آخر عمر تو بچی نے گزارنی ہے۔“

بیگم شفیع کی اس بات نے بھی عذرا اور رخسانہ کو متاثر کیا تھا۔ وہ لڑکی کی رائے کو اہمیت دینے والے لوگ تھے، سدرہ ان کے گھر میں خوش رہے گی۔ واپسی پر عذرا نے رخسانہ سے پوچھا۔ انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں مثبت رائے ظاہر کی تھی۔ ”لیکن پہلے لڑکے کے بارے میں چھان بین کر لیں، وہ کاروبار کیا کرتا ہے اور کچھ کماتا بھی ہے یا نہیں...... دکان جمنے میں بعض اوقات برسوں لگ جاتے ہیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“ عذرا بولیں۔

گھر آکر انہوں نے پہلے مصباح اور داماد کو فون کر کے رشتے کے بارے میں بتایا اور ان سے رائے مانگی۔ نسیم نے کہا۔ ”امی! میرے خیال میں چھان بین کرا لینی چاہئے۔ خاص طور سے لاہور میں ان کا پس منظر...... ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی اور معاملہ نکل آئے تو ہم پچھتا بھی نہ سکیں۔“

”وہ لوگ اپنے رکھ رکھاؤ سے شریف اور خاندانی لگتے ہیں۔“ اس تجویز پر عذرا نے تامل کیا۔ ”ایسا کرو تم پہلے لڑکے کے کاروبار کے بارے میں معلوم کراؤ۔“

ڈاکٹر نسیم نے اپنے ایک جاننے والے سے معلوم کرایا۔ یہ اچھا خاصا چلتا ہوا شاپنگ سینٹر تھا، نور کی شاپ اس کے عقبی حصے میں تھی، یہاں زیادہ لوگ نہیں جاتے تھے اور اس طرف کی زیادہ تر دکانیں بند پڑی تھیں، لڑکے نے دکان میں زیادہ کپڑا ابھی نہیں رکھا تھا لیکن شاپنگ سینٹر میں آس پاس کے دکاندار اس کی تعریف کرتے تھے کہ شریف اور اپنے کام سے کام رکھنے والا لڑکا تھا، گاہک کم آنے کے باوجود زیادہ تر اپنی دکان میں رہا کرتا تھا، فارغ اوقات میں کتابیں پڑھتا تھا، اس کی کسی سے برائی سننے میں نہیں آئی تھی۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر ایک روز عذرا، نور کی دکان پر پہنچ گئیں۔ کپڑے کے لحاظ سے معمولی سی دکان تھی، ورائٹی کم تھی اور زیادہ تر پرانی ورائٹی رکھی تھی۔ وہ خوش اخلاقی سے ملا، بوتل منگوا کر پلوائی۔ عذرا اس کے کاروبار کے بارے میں پوچھتی رہیں کہ کیسا چل رہا ہے۔

”بس آنٹی! ہلکا پھلکا چل رہا ہے، دن میں کچھ سوٹ بک جاتے ہیں تو خرچا نکل آتا ہے۔“

”اتنے میں گزارا کیسے ہوتا ہے؟“ عذرا نے پوچھ لیا۔

”کچھ دکان سے ہو جاتا ہے، کچھ ابو کی پنشن ہے۔“ اس نے گول مول انداز میں جواب دیا۔

”تم دکان میں اور کپڑا کیوں نہیں ڈلواتے، کپڑا زیادہ ہونے سے دکان اچھی چلے گی۔“

”آنٹی! بات وسائل کی ہے، ابھی میری اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں دکان میں مزید کپڑا ڈلوا سکوں۔“

عذرا کچھ دیر وہاں رکیں۔ انہوں نے دکان دیکھی تو انہیں مایوسی ہوئی تھی۔ اتنی سی دکان سے لڑکا اپنا اور اپنے گھر والوں کا گزارا کیسے کرے گا اور ان کی بیٹی کو کیسے رکھے گا۔ یہ بات ان کے ذہن میں نہیں آئی تھی کہ جب لڑکے والوں کے مالی حالات درست نہیں تھے تو وہ اس کی شادی پر کمربستہ کیوں تھے، اس مقصد کے لئے انہوں نے اخبار میں باقاعدہ اشتہار دیا تھا۔

بیگم شفیع نے فون کر کے اتوار کو آنے کا عندیہ دیا۔

عذرا بولیں۔ ”کیوں نہیں، بہن! ضرور آئیں، آپ کا اپنا گھر ہے۔“

اتوار والی صبح انہوں نے سدرہ سے کہا۔ ”کچھ لوگ آ رہے ہیں شام کے وقت...... تیار ہو جانا اور ناشتے کا سامان بھی بنا لینا، جو بازار سے منگوانا ہو، وہ بھی منگوا لینا۔“

سدرہ کھٹکی۔ اگر مہمان آ رہے ہیں تو اسے کیوں تیار ہونے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ مہمان اصل میں اس کے لئے آ رہے تھے۔ اس کا دل بے اختیار دھڑک اٹھا تھا۔ کتنے عرصے بعد کوئی اسے دیکھنے آ رہا تھا۔ اسے صورت شکل کے حوالے سے احساس کمتری نہیں تھا، اس سے کہیں کم صورت لڑکیاں بیاہ کر اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ اسے یقین تھا کہ اللہ میاں نے اس کے نصیب میں جو لکھا ہے، وہ اسے ضرور ملے گا۔

اس نے اپنا ایک اچھا سا سوٹ نکالا۔ شام کو ناشتے کی تیاری کرنا تھی اس لئے وہ کچن میں گھس گئی۔ شام کی خاصی تیاری اس نے قبل از وقت ہی کر لی تھی۔ پھر وہ نہانے چلی گئی، نہا کر اور کپڑے بدل کر اس نے ہلکا سا میک اپ کیا، بال بنائے پھر کچن میں چلی گئی۔

اسی اثناء میں کال بیل نے مہمانوں کی آمد کی اطلاع دی۔ بڑا کمرہ جو پہلے ٹیوشن سینٹر کے لئے مخصوص تھا، اب انہوں نے اسے نشست گاہ بنا لیا تھا۔ عذرا اور آنے والوں کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ مہمان آچکے تھے، اسے بے اختیار شرم آنے لگی۔

کچھ دیر بعد عذرا آئیں اور شربت لے گئیں اسے کہا۔ ”پندرہ بیس منٹ بعد آجانا سب لے کر۔“

”جی امی...... !“ اس نے سر ہلایا۔

ماں کے جانے کے بعد وہ ٹرالی میں سامان سجانے لگی۔ اسی میں اتنا وقت گزر گیا کہ وہ ٹرالی لے کر ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ ابھی اس نے سلام ہی کیا تھا کہ امی کے ساتھ بیٹھی خاتون نے اٹھ کر گرم جوشی سے اسے گلے سے لگا لیا تھا پھر اسے پیار کیا اور بولیں۔ ”ماشاء اللہ! کتنی پیاری بچی ہے، اب تک آپ نے اسے چھپا کر رکھا تھا۔“

عذرا کھل اٹھی تھیں۔ اب تک سدرہ کو دیکھنے والی کئی عورتیں آئی تھیں مگر کسی نے ایسی محبت اور گرم جوشی نہیں دکھائی تھی۔ سدرہ بھی متاثر ہوئی تھی۔ اس نے سامنے صوفے پر بیٹھے مرد کو سلام کیا تو اس نے بھی اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

خاتون نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ وہ بار بار اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھیں، محبت سے اس کے بارے میں پوچھ رہی تھیں، سدرہ کو بے پناہ شرم آرہی تھی۔

پھر جب وہ چائے اور ناشتے کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ وہ لوگ ایک گھنٹہ اور رہے اور پھر جانے سے پہلے خاتون نے اسے بلا کر اس کے ہاتھ پر ہزار کا ایک نوٹ رکھ دیا۔ پنجاب کے رواج کے مطابق یہ لڑکی پسند آنے کا استعارہ تھا پھر عذرا سے بولیں۔ ”بہن! آپ بیٹی کی مرضی بھی معلوم کر لیجئے گا، ہماری خوشی تو یہ بچی ہے، آگے جو رب کو منظور!“

ان لوگوں کے جانے کے بعد سدرہ نے سامان اٹھایا اور کچن میں جا کر برتن دھونے لگی۔ عذرا رات کا کھانا بنانے لگیں۔ رات کا کھانا وہی بناتی تھیں۔ کھانے کے بعد جب سدرہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو عذرا نے اس سے کہا۔ ”تمہارے بستر پر ایک لفافہ ہے، اس میں لڑکے کی تصویریں ہیں، دیکھ لو، اگر پسند آئے تو!“

”امی! میں آپ کی پسند پر راضی ہوں۔“ سدرہ نے جلدی سے کہا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

عذرا خوش ہوئیں۔ ”بہرحال ایک نظر ضرور دیکھ لینا۔“

کمرے میں آکر سدرہ نے لفافہ دیکھا پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اسے کھولا۔ اندر نور احمد کی تین مختلف تصاویر تھیں، یہ سب گھر میں لی گئی تھیں اور ان میں اس کی پرکشش شخصیت پوری طرح نمایاں تھی۔ سدرہ کو اسے دیکھتے ہوئے شرم آنے لگی تھی اور ساتھ ہی اسے محسوس ہوا کہ وہ اسے پسند کرنے لگی ہے، ایک ہی نظر میں...... اسی رات سدرہ کے خوابوں میں کئی رنگ شامل ہوگئے تھے۔

اگلے روز جب ماں نے اس سے اس کی پسند کے بارے میں پوچھا تو اس نے شرما کر سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”جیسی آپ کی مرضی امی!“

عذرا خوش ہوگئیں۔ ”جیتی رہو بیٹی!“

اسی شام مصباح اور نسیم ان کے ہاں آئے تھے۔ عذرا نے تفصیل سے اس رشتے کے بارے میں بتایا لیکن یہ بات نہ جانے کیوں چھپا گئیں کہ رشتہ انہوں نے اخبار میں دیکھ کر کیا ہے۔ شاید اس لئے کہ ایک زمانے میں وہ خود اس طرح کے رشتوں کی بے حد مخالفت کرتی آئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ رشتہ ہمیشہ جان پہچان کے لوگوں میں کرنا چاہئے، اس طرح دھوکے کا امکان کم ہو جاتا ہے لیکن سدرہ کے رشتے نہ آنے اور پھر اس کی بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے وہ مجبور ہوگئی تھیں کہ خود اخباری رشتے کا سہارا لیں۔

انہوں نے سدرہ اور بیٹی، داماد کو یہی بتایا تھا کہ رشتہ ایک جاننے والی خاتون کے توسط سے آیا تھا۔ مصباح کو تعجب ہوا کہ ایسی جاننے والی خاتون کون ہیں لیکن اس نے ماں سے وضاحت نہیں مانگی تھی۔

”امی! آپ ان کے بارے میں اچھی طرح چھان بین کریں۔“ نسیم نے سنجیدگی سے ساس سے کہا تھا۔ ”اجنبی لوگوں میں رشتہ کرتے وقت ہمیشہ محتاط رہنا چاہئے۔“

”بیٹا! میں نے اپنی حد تک اطمینان کیا ہے، دیکھنے میں اور بات چیت سے وہ لوگ سادہ اور شریف لگتے ہیں، اب یہ تمہارا کام ہے کہ ان کے بارے میں چھان بین کرو۔“

”میں کر لوں گا۔“ ڈاکٹر نسیم نے انہیں یقین دلایا۔ ”آپ ان کے گھر اور لڑکے کی شاپ کا پتا دے دیں۔“

سدرہ کو انکوائری کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں لیکن وہ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ عذرا نے نور احمد کی دکان اور فلیٹ کا پتا ڈاکٹر نسیم کو دے دیا۔ اس نے کہا۔ ”میں ہفتہ دس دن میں ان کے بارے میں انکوائری کر لوں گا، اس دوران وہ آپ سے رابطہ کریں تو انہیں کوئی جواب نہ دیں۔“

”میں اطمینان کئے بغیر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کروں گی۔“ عذرا بولیں۔

”بالکل ٹھیک!“ مصباح بولی۔ ”کسی دھوکے باز کے ہاتھوں میں پھنسنے سے بہتر ہے کہ سدرہ آرام سے اپنے گھر میں بیٹھی رہے۔“

اس بات پر سدرہ غصے سے بل کھا کر رہ گئی تھی۔ اس نے سوچا۔ واہ! اپنی تو شادی ہوگئی ہے، اپنے گھر میں شوہر اور بچوں کے ساتھ آرام سے رہ رہی ہے اور مجھے مشورہ دیا جا رہا ہے کہ میں ماں کے پاس رہوں۔

عذرا نے بیٹی کے تاثرات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اسے انکوائری کی یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔ مصباح اور نسیم کے جانے کے بعد انہوں نے سدرہ سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے، تم چپ کیوں ہیں؟“

”امی! جب آپ ان لوگوں سے مل لی ہیں تو پھر یہ انکوائری وغیرہ کیا ضروری ہے؟“ سدرہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

”ضروری ہے میری بچی...... ! آخر کسی کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ وہ دھوکے باز ہے یا ہم سے کوئی کچھ چھپا رہا ہے، اس کے لئے تحقیق کرنا ہی پڑتی ہے۔“ ماں نے اسے سمجھایا۔

”جیسی آپ کی مرضی!“ سدرہ بیزاری سے کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

عذرا پرخیال نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس رشتے میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی تھی۔ شاید تصاویر دیکھ کر اس کا جھکاؤ نور احمد کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ خود بھی نور کو پسند کرتی تھیں، اس کے ماں باپ بھی انہیں اچھے لگے تھے لیکن وہ ایک اندھا قدم اٹھا کر رسک لینے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جب تک ان کا پورا اطمینان نہیں ہو جائے گا، وہ ان لوگوں کو ”ہاں“ نہیں کریں گی البتہ سدرہ کا رویہ انہیں پریشان کر رہا تھا۔

اگلے روز بھی جب وہ چپ چپ سی رہی تو انہوں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ ”نارمل رہو...... اس بات کو اپنے اعصاب پر سوار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”سوار تو آپ نے کیا ہے۔“ سدرہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”اٹھتے، بیٹھتے آپ میری شادی کا رونا روتی تھیں، ہر آئے گئے کے سامنے رشتے کا ذکر کرتی تھیں اور اب ایک رشتہ آیا ہے تو آپ انکوائری کے چکر میں پڑی ہیں۔“

عذرا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”یہ تم کس انداز میں مجھ سے بات کر رہی ہو؟“

”ٹھیک انداز میں بات کر رہی ہوں۔“ سدرہ نے چیخ کر کہا اور میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

عذرا اسے حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ان کی عمر ابھی محض چوالیس برس تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگی تھیں۔ شاید اس لئے کہ وہ اب نواسے اور نواسی والی ہوگئی تھیں، انہوں نے اپنے بال رنگنا چھوڑ دیئے تھے اور سفید لٹوں کی وجہ سے اپنی عمر سے بڑی ہی نظر آتی تھیں، جسم مزید بھاری ہو گیا تھا۔ وہ اندر سے بھی خود کو کمزور محسوس کرنے لگی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ سدرہ کی شادی کے بعد وہ کوچنگ سینٹر چھوڑ دیں گی، اسے کسی اور کے حوالے کر دیں گی یا اسے ختم کر کے دوسری منزل بھی کرائے پر اٹھا دیں گی، خود وہ صرف جاب کریں گی اور باقی وقت آرام کریں گی۔

ایک ہفتے کے بعد نسیم نے انہیں فون کیا۔ ”آنٹی! میں مصروفیت کی وجہ سے نہیں آسکا، گھر بھی لیٹ جا رہا ہوں، میں نے ان کے بارے میں انکوائری کرائی ہے، کوئی مشکوک بات سامنے نہیں آئی ہے لیکن پھر بھی میرا مشورہ ہے، آپ اس معاملے میں جلد بازی نہ کریں۔“

”لیکن کیوں بیٹا؟“ وہ بولیں۔ ”سدرہ ماشاء اللہ 23 برس کی ہو رہی ہے۔“

”آنٹی! اول تو وہ لوگ صرف تین مہینے پہلے اس فلیٹ میں آئے ہیں، فلیٹ بھی ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے توسط سے لیا ہے جو اپنا کمیشن دیکھتے ہیں، لوگوں کا پس منظر نہیں دیکھتے۔ نور احمد نے دکان بھی صرف دو مہینے پہلے کھولی ہے اور اس کا کاروبار بھی نہ ہونے کے برابر ہے، دن میں ایک آدھ سوٹ بک جاتا ہے اور کبھی وہ بھی نہیں، اس نے دکان کا ایڈوانس تک نہیں دیا ہے، صرف کرایہ دے رہا ہے، آپ خود سوچیں وہ ان حالات میں شادی کیسے کرے گا اور کرے گا تو بیوی کو کہاں سے کھلائے گا۔“

”ان کے رہنے سہنے سے تو نہیں لگتا کہ انہیں کوئی مالی پریشانی ہے، گھر میں ضرورت کی ہر شے موجود ہے، جب وہ ہمارے گھر آئے تو ٹیکسی میں آئے تھے، بڑا سا کیک لائے تھے۔“

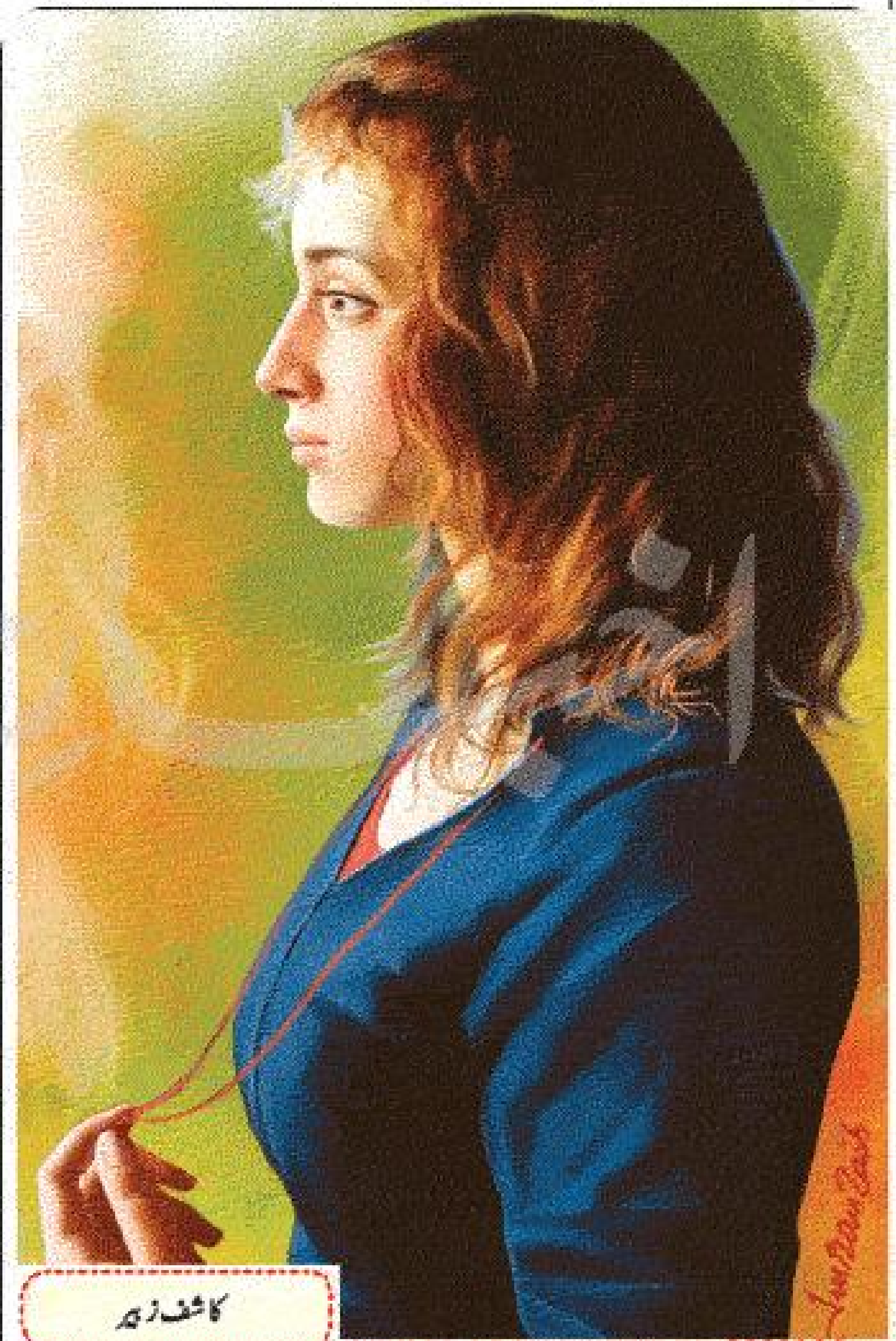
(جاری ہے)

''آنٹی یہ سب دکھاوا بھی ہو سکتا ہے۔'' نسیم بے زاری سے بولا۔

''میں نے بتا دیا ہے آگے جو آپ بہتر سمجھیں۔''

''تم نے کہا تھا کہ اس کے بزنس کے بارے میں معلوم کرو گے؟''

''میرا جو جاننے والا لاہور میں ہے، وہ ان دنوں کسی کورس کے سلسلے میں لندن گیا ہے۔ اس لئے فی الوقت لاہور کی انکوائری نہیں کرا سکتا۔ میرے پاس وقت ہوتا تو میں خود چلا جاتا۔''



فریبی

کاشف زبیر

قسط : 2

29 دسمبر 2008ء تا 4 جنوری 2009ء

''اچھا بیٹا تمہارا شکریہ۔'' عذرا بے دلی سے بولیں۔ ان کا خیال تھا کہ نسیم مثبت رائے دے گا لیکن اس کی رائے ان کی توقع کے خلاف تھی۔ نسیم ان کا احترام کرتا تھا۔ ان کی بات بھی مانتا تھا لیکن ایک حد میں رہ کر۔ وہ ان کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ دخل دیتا تھا اور نہ ہی یہ پسند کرتا تھا کہ اس کے گھریلو معاملے میں سسرال والے مداخلت کریں۔ اس وقت بھی اس کا انداز ایسا ہی تھا کہ جی چاہے تو مانیں ورنہ آپ کی مرضی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ صرف اپنی رائے دے رہا ہے۔

اس کے اگلے روز بیگم شفیع کا فون آ گیا۔

''بہن آپ نے کیا سوچا ہے؟'' وہ بولیں۔ ''ہم بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔''

''اس قسم کے معاملات میں جلد بازی نہیں کی جاتی ہے۔'' وہ آہستہ سے بولیں۔ ''آپ ہمیں کچھ وقت دیں انشاء اللہ کوئی بہتر ہی بات ہوگی۔''

بیگم شفیع خاصی دیر ان سے بات کرتی رہیں اور ان کا زور اس پر تھا کہ انہیں سدرہ بے حد پسند آئی ہے۔ وہ بہر صورت اسے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دلہن کے لئے بری بہت عرصے سے بنا رکھی تھی اس میں سونے کے تین سیٹ اور اکیس کام والے جوڑے تھے۔

''بہن ہم آپ کی بچی کو اپنی بچی سمجھ کر پھولوں کی طرح رکھیں گے۔'' وہ بولیں۔

عذرا ہچکچائیں۔ ''بہن...... بات یہ ہے کہ بچے کا کام ابھی شروع ہوا ہے۔ اگر کام جمنے تک یہ نیک کام ملتوی ہو جائے تو......''

''دیکھیں بہن۔ رزق تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور پھر عورت اپنے نصیب کا لے کر آتی ہے۔ آپ بسم اللہ تو کریں۔''

عذرا رحمان تذبذب میں پڑ گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ان لوگوں کو بیٹے کی شادی کی جلدی ہو رہی ہے۔ اگر وہ ان سے مایوس ہو گئیں تو کہیں اور کوشش کر سکتے ہیں۔ اس لئے جب بیگم شفیع نے تجویز پیش کی کہ فی الوقت بات پکی کر لی جائے، شادی بعد میں بھی کی جا سکتی ہے تو انہوں نے کہا کہ وہ اپنے داماد اور بیٹی سے مشورہ کر کے اس بارے میں بتائیں گی۔ پھر انہوں نے رات کو مصباح کو بلا لیا اس کے سامنے ساری صورتحال رکھی۔

''مجھے خطرہ ہے کہ یہ رشتہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر اتنا معقول رشتہ نہیں آئے گا۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ بات پکی کر لیتے ہیں۔ اس دوران شادی کے لئے وقت لے لیں گے۔''

''اور کوئی دھوکے والا معاملہ سامنے آیا تو'' مصباح نے خدشہ ظاہر کیا۔

''تب بھی رشتہ توڑنا آسان ہوگا۔ شادی کے بعد تو آدمی بے بس ہو جاتا ہے۔''

''جیسی آپ کی مرضی امی۔'' مصباح بے دلی سے بولی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ماں اتنی عجلت کیوں دکھا رہی ہیں۔

داماد نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس لئے عذرا نے اپنے سارے رشتے داروں کو اس رشتے کے بارے میں بتا دیا۔ وہ لوگ جو اپنے نکھے بیٹوں کے لئے آس لگائے بیٹھے تھے اور رشتہ مانگنے سے بھی ہچکچا رہے تھے کیونکہ ان کے لڑکے پریوں کے خواب دیکھتے تھے اور سدرہ ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ جب اس رشتے کا پتا چلا تو وہ نئے سرے سے فساد کھڑا کرنے آ گئے۔ خاص طور سے سدرہ کی خالہ اور عذرا کی اکلوتی بہن کا رویہ بے حد جارحانہ تھا۔ اس نے بہن سے خوب جھگڑا کیا کہ تم کو اپنے خاندان کے لڑکے نظر نہیں آتے۔ پہلے بڑی بیٹی کا رشتہ غیروں میں کیا اور اب چھوٹی بھی نہ جانے کن لوگوں کو دے رہی ہو۔

عذرا نے بھی برابر کا جواب دیا۔ ''میری بیٹی آج پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ چوبیس سال کی ہو رہی ہے اور تم لوگوں کے سامنے ہے، کسی کو جھوٹے منہ توفیق نہیں ہوئی کہ اشاروں میں سہی مجھ سے رشتے کے لئے کہتا۔ جب تم لوگوں سے مایوس ہو کر باہر رشتہ کر رہی ہوں تو لڑنے آ گئیں۔''

بہن کھسیا کر بولی تھی۔ ''وہ تو میں مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔''

عذرا نے طنز کیا۔ ''میری بیٹی کے بالوں میں سفیدی آنے کا۔''

''بات یہ ہے کہ تم ہم سے رشتہ رکھنا ہی نہیں چاہتیں کہ کہیں ہم تمہارا مکان نہ کھا جائیں۔''

''اور صحیح بات یہی ہے کہ تم لوگوں کی نظر اس مکان پر ہے۔ یہی میری بچیوں کا حق ہے اور کوئی ان سے یہ حق چھین نہیں سکتا۔''

''ہمیں کیا غیروں کو دو۔'' بہن بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی تھی۔

عذرا کو اتنا غصہ آ رہا تھا کہ انہوں نے شفیع احمد کے گھر فون کر کے انہیں منگنی کا عندیہ دے دیا۔ وہ لوگ کھل اٹھے تھے۔ آنے والے اتوار کو منگنی کی تاریخ طے ہو گئی۔ عذرا نے کہا۔ ''بھائی صاحب میں نے سوچا ہے کہ منگنی سادگی سے کریں۔ بس آپ کا اور ہمارا گھرانہ ہو۔ اس خوشی کے موقع پر۔''

''بہن جیسی آپ کی مرضی اور اصل بات تو رشتہ طے کرنے کی ہے اس میں دھوم دھام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نیکی کا کام جتنی سادگی سے ہو، اللہ اتنی برکت دیتا ہے۔''

''تو آپ آ جائیں اگلے اتوار کو۔'' انہوں نے کہا۔

سدرہ نے یہ سنا تو خوش نظر آنے لگی۔ عذرا اسے دیکھ کر خوش تھیں ان کے اس طرح ہاں کرنے میں خاصی حد تک دخل سدرہ کی خوشی کا تھا۔ عذرا نے محسوس کیا کہ وہ اس رشتے پر راضی ہے۔ مصباح اور نسیم اس رشتے کے طے کئے جانے پر اتنے خوش نہیں تھے، ان کا خیال تھا کہ ''ہاں'' کرنے سے پہلے اچھی طرح جانچ پڑتال کر لینی چاہیے تھی۔

اتوار کو ہونے والی تقریب میں وہ دونوں بھی شامل تھے۔ طے ہوا تھا کہ لڑکے کی طرف سے اس کی ماں اور باپ آئیں گے اور وہی رسم ادا کریں گے۔

اتوار کو عذرا نے صبح سے تیاری شروع کر دی تھی۔ سدرہ کے لئے بوتیک سے نیا سوٹ منگوایا تھا، ہار پھول تھے۔ شام کے وقت شفیع احمد اور ان کی بیگم آئے۔ مصباح بھی بڑھ چڑھ کر تمام کاموں میں حصہ لے رہی تھی لیکن نسیم کھنچا کھنچا سا تھا۔

رسم سادگی سے کی گئی۔ بیگم شفیع نے سدرہ کو سونے کی نازک سی انگوٹھی پہنا کر اسے اپنے بیٹے کی منگیتر بنا لیا۔ پھر مصباح کے اشارے پر نسیم کو بھی اپنا موڈ بحال کرنا پڑا۔ سدرہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کے لئے سوٹ اور دوسرا سامان آیا تھا۔ ہر شے اعلیٰ درجے کی تھی۔ عذرا کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔

منگنی کے بعد ایک تعلق بن گیا تھا، اس لئے شفیع احمد اور اس کی بیوی بیٹا بے تکلفی سے ان کے گھر آنے لگے۔ شفیع اور بیگم تو ہر تیسرے چوتھے دن آ جاتے تھے۔ نور احمد بھی ہفتے میں ایک چکر لگا لیتا تھا۔ شروع شروع میں عذرا کو ان کا آنا اچھا لگا تھا لیکن پھر الجھن ہونے لگی۔ اگرچہ وہ خاطر تواضع سے منع کرتے تھے مگر پھر بھی وہ اہتمام کر لیا کرتی تھیں۔ مہینے میں آٹھ دس دعوتوں کا بوجھ پڑ جاتا تھا۔ پھر لڑکے کا اس طرح ہر ہفتے باقاعدگی سے آنا بھی انہیں الجھن میں ڈال رہا تھا کہ رشتے دار اور جاننے والے کیا کہیں گے، حالاں کہ سدرہ، نور احمد کے سامنے بھی نہیں آتی تھی، اس کے باوجود کہنے والوں کی زبانیں تو نہیں روکی جا سکتی تھیں۔

عذرا کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ان لوگوں کو صاف منع بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ ان دعوتوں کی وجہ سے ان کا کہیں اور آنا جانا بھی محدود ہو گیا تھا، خاص طور پر چھٹی کے دن وہ سب آتے تھے۔ دوپہر کے وقت آتے اور شام کو جاتے تھے۔ اس کے بعد عذرا کے لئے وقت نہیں رہتا تھا کہ کہیں اور جا سکیں۔ باقی ہفتے میں ان کی اور سدرہ کی اپنی مصروفیات ہوا کرتی تھیں۔

وہ لوگ جب آتے عذرا شادی کا ذکر ضرور کرتیں، لیکن وہ لوگ ٹال جاتے تھے۔ ایک دو بار انہوں نے کھل کر کہا تو بیگم شفیع اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولیں۔ ''بہن ابھی نور احمد اپنا کاروبار جمانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن پیسے کی کمی کی وجہ سے اسے دشواری ہو رہی ہے یہ دشواری دور ہو جائے تو پھر ہم شادی کرنے کے قابل ہو سکیں گے۔''

''یہ ٹھیک ہے لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ نے شادی کی ساری تیاری کر رکھی ہے۔''

''ہاں مگر بری کے علاوہ بھی اور اخراجات ہوتے ہیں۔ پھر ولیمہ ہو گا۔ ماشاء اللہ لاہور میں ہمارا بہت بڑا خاندان ہے، سب کو بلانا اور ٹھہرانا ہوگا۔''

''بہن اصل چیز تو نکاح ہے جو سادگی سے ہو سکتا ہے، باقی تو بس نمائش ہے۔ اگر شادی سادگی سے ہو تو کیا برائی ہے۔''

''کتنی ہی سادگی سے کر لیں لیکن کچھ خرچا تو ہوتا ہی ہے، ابھی ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں۔'' شفیع احمد نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''نور کوشش کر رہا ہے کہ اسے چار پانچ لاکھ روپے مل جائیں تو وہ اپنا کاروبار بہتر طریقے سے سیٹ کر سکے، اسی صورت میں ہم جلدی شادی کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔''

عذرا کو ذرا مایوسی ہوئی تھی۔ اگلی بار نور احمد اکیلا آیا تھا اور اس نے گفتگو کے دوران کچھ اس انداز میں بات کی جیسے وہ ان سے مالی مدد کی توقع کر رہا ہو۔ عذرا الجھن میں پڑ گئی تھیں کہ اسے کیا جواب دیں۔ اس رات سدرہ نے ماں سے کہا۔ ''امی آپ نور کو پیسے دے دیں تاکہ وہ اپنا کاروبار سیٹ کر سکیں۔''

''لیکن میرے پاس اتنی رقم کہاں ہے اسے تو چار پانچ لاکھ کی ضرورت ہے۔''

''امی ہم انہیں بینک سے قرض دلوا سکتے ہیں۔''

''بینک والے ایسے قرض نہیں دیتے ان کو ضمانت دینی پڑتی ہے۔''

''پلیز امی ضمانت آپ دے دیں۔'' سدرہ نے التجا کی۔

عذرا سمجھ رہی تھیں کہ سدرہ بھی جلد شادی کے حق میں ہے۔ شاید وہ خوف زدہ تھی کہ یہ رشتہ ختم ہو گیا تو پھر اسے کوئی معقول رشتہ نہیں ملے گا اور پھر وہ نور احمد کو پسند بھی کرنے لگی تھی۔ سدرہ کی بات نے انہیں شش و پنج میں ڈال دیا تھا۔ اگر وہ نور کو بینک سے قرض دلواتی تو انہیں اپنا مکان رہن رکھنا پڑتا اور اس صورت میں مصباح اور نسیم لازماً مخالفت کرتے۔ ان سے چھپا کر یہ کام کرنے میں خطرہ تھا کہ بعد میں یہ بات کھل گئی تو بیٹی داماد کے دل میں میل آ جائے گا۔ دوسری طرف انہیں سدرہ کی خوشی کا خیال بھی تھا۔ ان سب باتوں نے ان کا بلڈ پریشر اتنا بڑھا دیا کہ وہ بستر پر لیٹ گئی تھیں۔ سدرہ مسلسل ان پر دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ نور کو قرض دلوا دیں تاکہ وہ اپنا کاروبار بڑھا سکے اور انہیں جلد شادی کرنے کے لئے کہا جا سکے۔

''بیٹی مصباح اور نسیم نہیں مانیں گے۔'' انہوں نے کہا۔

''واہ...... خود اپنی زندگی بنا لی اور میری باری آئی تو نہیں مانیں گے۔'' سدرہ تلخی سے بولی۔ ''امی آپ نور کے لئے جو کریں گی وہ میرے ہی تو کام آئے گا۔''

''ہاں پھر بھی ڈر تو لگتا ہے۔'' عذرا آہستہ سے بولیں۔

''امی آپ اللہ کا نام لے کر یہ کام کریں۔ انشاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔ آپ جانتی ہیں کپڑے کے کام میں برکت ہوتی ہے۔''

عذرا نے خاصا سوچا اور پھر سدرہ کی بات مان لینے کا فیصلہ کیا۔ اگلی بار جب نور احمد آیا تو انہوں نے اس سلسلے میں اس سے بات کی، اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا تھا۔ ''سچ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ کیا واقعی بینک سے مجھے قرض مل سکتا ہے۔ آپ جانتی نہیں ہیں، آنٹی میں اس سلسلے میں کتنا پریشان ہوں۔ سیزن سر پر ہے اور میرے پاس کپڑا نہیں ہے۔ اگر مجھے رقم مل جائے اور میں نے کپڑا ڈلوا لیا تو انشاء اللہ دو سال میں قرض کی رقم واپس کر دوں گا۔''

عذرا رحمان نے ایک پرائیویٹ بینک میں پرسنل لون کی درخواست دے دی۔ اس میں سود کی شرح کم تھی۔ وجہ انہوں نے بیٹی کی شادی بتائی تھی اور چار لاکھ کے بدلے اپنا مکان رہن رکھ دیا جس کی مالیت کم از کم چالیس لاکھ روپے تھی۔ قرض پانچ سال کے لئے لیا گیا تھا۔ جب عذرا رحمان نے رقم نور احمد کے حوالے کی تو اس کی خوشی اور شکر گزاری دیکھنے والی تھی۔ عذرا شرمندہ ہو گئی تھیں۔

''سدرہ کے رشتے سے اب تم بھی میرے بیٹے ہو اور مائیں بیٹوں کے لئے اس سے بھی زیادہ کرتی ہیں۔ بس خیال رکھنا کہ بینک کی کوئی قسط ڈیفالٹ نہ ہو۔''

''آپ فکر نہ کریں آنٹی۔ میں مرنا گوارا کر سکتا ہوں لیکن آپ کی عزت پر آنچ آئے یہ ہرگز گوارا نہیں ہے۔ میں کل ہی کپڑا لاتا ہوں۔ ایک ہفتے بعد آپ دکان دیکھئے گا، وہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوگی۔''

''انشاء اللہ'' عذرا آنے والے خوش رنگ سپنوں میں کھو گئی تھیں۔ سدرہ کی ذمے داری ادا کر کے وہ ہلکی پھلکی ہو جاتیں۔ انہوں نے سوچا تھا کہ جب وہ پچاس کی ہو جائیں گی تو یہ مکان بیچ کر اپنے لئے آس پاس کوئی چھوٹا دو کمروں کا فلیٹ لے لیں گی اور مکان سے ملنے والی رقم سے اپنے نواسے نواسیوں کے لئے ڈیفنس سرٹیفکیٹس خرید لیں گی۔

سدرہ بے حد خوش تھی، اس نے ماں سے کہا۔ ''دیکھئے گا امی اب نور کا بزنس کتنا اوپر جائے گا وہ بہت باصلاحیت اور محنتی ہیں۔''

''مجھے تو تم دونوں کی خوشی عزیز ہے۔'' عذرا نے محبت سے بیٹی کو دیکھا۔

ایک ہفتے بعد وہ کسی کام سے شاپنگ کرنے نکلیں تو انہوں نے سوچا کہ نور کی دکان کا ایک چکر لگا لیں وہ اس کی دکان پر پہنچیں تو وہاں گاہکوں کا خاصا رش تھا۔ نور نے دکان کپڑے سے بھر لی تھی انہیں دیکھ کر وہ مصروفیت کے باوجود ان کی خاطر تواضع کے لئے بچھ بچھ گیا۔ ''آنٹی ......بس چند مہینوں کی بات ہے پھر دیکھئے گا۔''

یہ سب دیکھ کر عذرا بے حد مطمئن تھیں، ان کے سامنے دیکھتے دیکھتے کئی سوٹ بک گئے تھے خود انہوں نے اپنے اور سدرہ کے لئے دو سوٹ لئے تھے اور نور نے ان کے اصرار کے باوجود پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ خوشی سے گھر واپس آئی تھیں۔ انہوں نے سدرہ کو اس بارے میں بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئی۔ اس کے دو دن بعد بیگم اور شفیع احمد ان کے گھر آئے۔

''بہن اب ہم اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں۔'' بیگم شفیع نے کہا۔

''مگر ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ حالات سازگار ہونے پر شادی کریں گے۔'' عذرا نے انہیں یاد دلایا۔

شفیع احمد شرمندہ ہو گیا تھا۔ ''بہن وہ بات بھی درست تھی اس وقت نور کی دکان سے کچھ نہیں مل رہا تھا بلکہ الٹا جیب سے جا رہا تھا۔ آپ نے احسان کیا۔ اسے قرض دلوایا اب یہ حال ہے کہ روز کی چھ سات ہزار کی سیل ہو رہی ہے۔ خرچا نکال کر بھی ایک ہزار سے اوپر بچت ہو رہی ہے۔ اب ہمیں اطمینان ہے کہ سدرہ بیٹی کو ہمارے ہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''ہماری کوئی بیٹی نہیں ہے۔'' بیگم شفیع بولیں۔ ''لیکن ہمیں دوسروں کی بیٹی کا احساس ہے۔ ہم سدرہ کو شہزادیوں کی طرح رکھنا چاہتے ہیں۔''

''چلئے گھر کے اخراجات کا مسئلہ حل ہو گیا لیکن آپ نے کہا تھا کہ شادی کے دوسرے اخراجات بھی ہوتے ہیں۔''

''بہن بس شرمندہ نہ کریں، اس وقت آپ نے سادگی سے شادی کا کہا تھا ہم نے اس پر غور کیا واقعی اصل چیز تو ہمارے بچوں کی خوشی ہے۔ باقی باتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم سدرہ کو سادگی سے بیاہ کر لے جا سکتے ہیں۔ زیادہ دھوم دھڑکے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم ولیمہ بھی سادگی سے کریں گے۔''

عذرا نے سوچا نہیں تھا کہ یہ لوگ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کریں گے۔ نور کو قرض دلوائے دس دن بھی نہیں ہوئے تھے اور یہ لوگ شادی کی تاریخ لینے آ گئے تھے۔ لیکن ان کی اس بات سے ان کے دل میں جو تھوڑے بہت خدشات تھے وہ بھی نہ رہے، انہیں یقین ہو گیا کہ یہ لوگ سچ مچ بے حد سادہ اور مخلص لوگ ہیں۔ وہ ان کی بیٹی کو خوش رکھ سکتے تھے پھر بھی انہوں نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''ابھی نور اپنا کام جما رہا ہے، شادی کے لئے وقت نکالے گا، اس کے بعد بھی خاصی مصروفیات ہوتی ہیں۔''

''اس کی فکر نہ کریں بہن، میں نے بھی دکان پر بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔'' شفیع احمد نے بتایا۔ ''ایسی کوئی ضرورت پیش آئی تو میں دکان سنبھال لوں گا۔''

''پھر بھی مجھے اپنے رشتے داروں سے مشورہ کرنا ہوگا۔''

''ضرور...... آپ مشورہ کریں لیکن ہمیں سدرہ جلدی چاہیے۔ بے شک آپ اسے تین کپڑوں میں رخصت کریں، ہم ہنسی خوشی لے جائیں گے۔'' بیگم شفیع نے کہا۔ ''بہن آپ جہیز کی تیاری میں وقت ضائع نہ کریں۔''

''ارے اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میں نے سدرہ کے لئے بہت کچھ بنا لیا تھا۔ انشاء اللہ کوئی کمی نہیں ہوگی۔''

''تو بہن بسم اللہ کریں۔ نیک کام میں ویسے بھی تاخیر کا حکم نہیں ہے۔''

''میں بیٹی اور داماد سے پوچھ کر تاریخ دوں گی۔''

''آپ بات کر لیں۔ ہم اگلے اتوار کو تاریخ لینے آ رہے ہیں۔ بس اب انکار مت کیجئے گا۔''

عذرا ان کے بے پناہ اصرار کے آگے مجبور ہو گئی تھیں۔ ''ٹھیک ہے تب تک میں مشورہ کر لوں گی۔''

''بہن اللہ کا نام لے کر عید کے بعد کی کوئی تاریخ طے کر لیں۔'' اس بار شفیع احمد نے کہا۔

''بس دو مہینے۔'' وہ بوکھلا کر بولی تھیں۔

''شادی کے لئے تو ایک دن بھی کافی ہے۔'' بیگم شفیع بولیں۔

عذرا نے مصباح اور نسیم سے بات کی۔ انہوں نے بیٹی داماد کو نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے نور کو کاروبار کے لئے چار لاکھ قرض لے کر دیا تھا۔ بس یہ بتایا کہ اس نے کاروبار اچھے پیمانے پر شروع کر دیا ہے۔ انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا صرف مصباح نے دبی زبان میں تیاری کے لئے وقت کی بات کی لیکن عذرا نے کہہ دیا کہ دو مہینے کافی ہوتے ہیں۔ اگلے اتوار کو جب بیگم اور شفیع احمد آئے تو عذرا نے انہیں عید کے چوتھے دن کی تاریخ دے دی۔ وہ خوش ہو گئے تھے۔

''اس وقت تک سیزن بھی ختم ہو جائے گا۔'' شفیع احمد نے کہا۔ ''رش کم ہو جائے گا تو میں دکان سنبھال لوں گا، نور کے پاس وقت ہوگا یہ لوگ کہیں گھومنے پھرنے اور دعوتوں میں بھی جا سکیں گے۔''

تاریخ طے ہوتے ہی عذرا نے شادی کی تیاری شروع کر دی۔ مصباح نے کہا کہ وہ سارا فرنیچر مع بیڈ روم سیٹ کے دے گی۔ زیور اور کپڑے عذرا نے پہلے ہی تیار کر لئے تھے۔ اب باقی سامان رہ گیا تھا اس میں خاصا کچھ خاندان والوں نے دینے کا کہا تھا اور باقی عذرا نے خریدنا شروع کر دیا۔

شفیع احمد کا فلیٹ خاصا بڑا تھا، اس میں چار کمرے تھے جن میں سے دو اٹیچ باتھ کے ساتھ تھے۔ سوائے نشست گاہ کے باقی ہر جگہ معمولی فرنیچر تھا اور ایک کمرہ تو بالکل خالی پڑا تھا۔ انہوں نے سارا سامان شادی سے پندرہ دن پہلے ہی وہاں پہنچا دیا تھا۔ بری بھی دس روز پہلے آئی تھی۔ زیور شاندار تھا لیکن کپڑے معمولی تھے اور وہ بھی صرف گیارہ جوڑے۔ بیگم شفیع نے ان سے معذرت کی کہ اکثر کام والے جوڑوں کو کیڑوں نے برباد کر دیا تھا۔

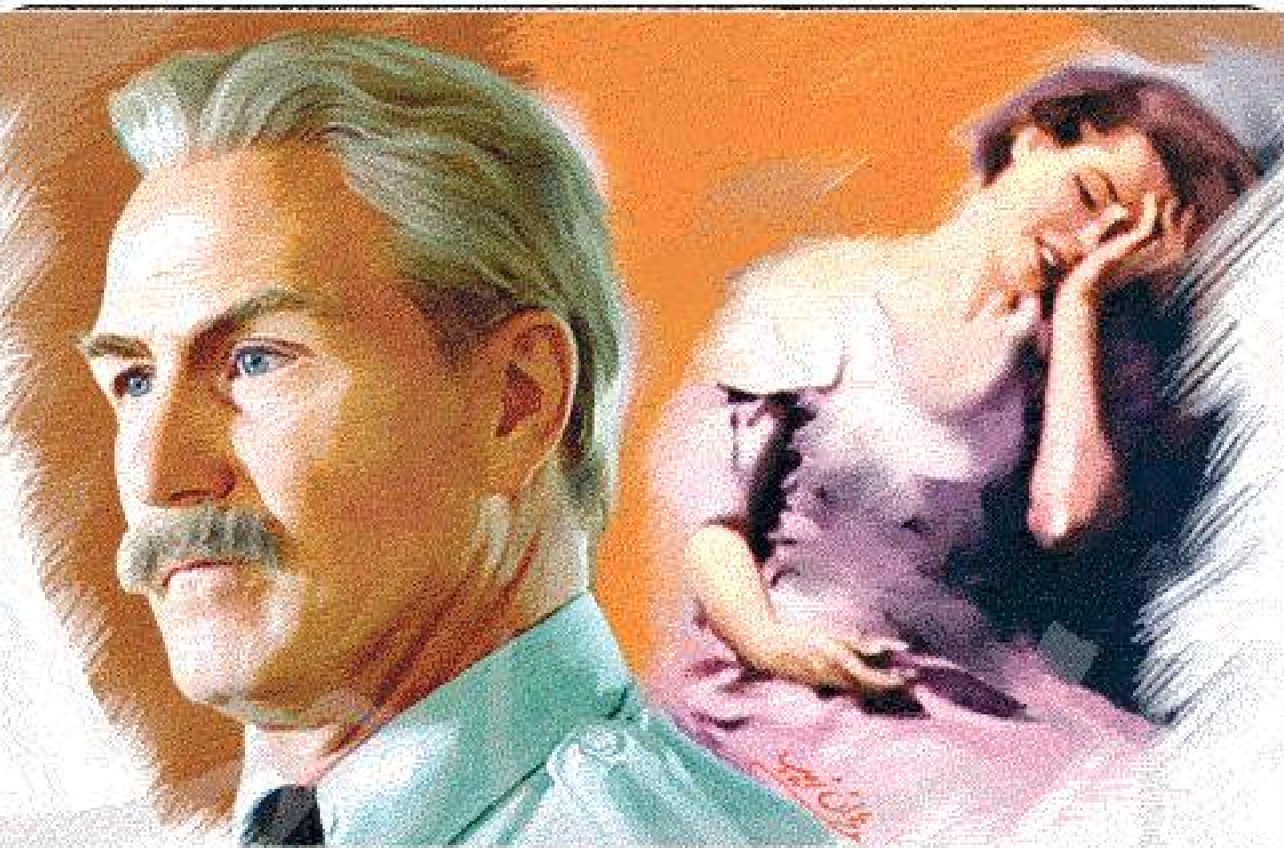
''کوئی بات نہیں بہن...... لڑکی آپ کے پاس آئے گی سوا سے خود بنا دیجئے گا۔'' انہوں نے تسلی دی۔

شادی اور ولیمے کے معمولی سے کام والے کپڑے تھے۔ سدرہ کو انہیں دیکھ کر دکھ ہوا تھا لیکن ماں نے اسے سمجھایا۔ ''بیٹی اس قسم کے معاملات میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

29/دسمبر 2008ء تا 4/جنوری 2009ء

دیکھتے ہی دیکھتے شادی کی تاریخ آگئی۔ ولیمہ، شادی کے ایک ہفتے بعد رکھا گیا تھا۔ شفیع احمد نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ ان کے کچھ رشتے دار بزرگوں کی برسیاں ان تاریخوں میں آرہی تھیں اس لئے ولیمہ اتنی تاخیر سے رکھا تھا۔ کارڈ چھپ کر آگئے تھے۔

سدرہ کی رخصتی کے بعد عذرا گھر آئیں تو خالی گھر انہیں کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ اس روز وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں۔ مصباح ماں کی دل جوئی



کے لئے ان کے پاس ہی رک گئی تھی۔ اگلے روز وہ سدرہ سے ملنے گئے۔ شفیع احمد نے بتایا کہ ان کے رواج کے مطابق دلہن تیسرے دن اپنے گھر جاتی ہے۔ ویسے سدرہ انہیں بے حد خوش نظر آئی تھی اور یہی ان کے اطمینان کے لئے کافی تھا۔

تیسرے دن سدرہ گھر آئی تو انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔ "وہ لوگ کیسے ہیں؟"

"امی بہت اچھے۔" سدرہ نے سرشار لہجے میں کہا۔ خاص طور پر نور میرا اتنا خیال رکھتے ہیں کہ میں بتا نہیں سکتی۔"

سدرہ کو خوش دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہوگئی تھیں۔ ایک رات رہ کر سدرہ اگلی صبح واپس چلی گئی۔ نور اسے لینے آیا تھا۔

اسی شام انہوں نے سدرہ کو فون کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ ان کے گھر کے فون میں کوئی مسئلہ تھا۔ بیل جا رہی تھی لیکن کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ انہوں نے نور کے موبائل پر فون کیا۔ "کیا گھر کا فون خراب ہے؟"

"جی امی۔" اب وہ عذرا کو امی کہتا تھا۔ "نہ جانے کیا مسئلہ ہے۔ میں نے کمپلین کرادی ہے شاید ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے۔"

"سدرہ سے بات ہو سکتی ہے۔"

"امی میں باہر ہوں، کچھ کام تھے، کچھ انتظامات کرنے تھے اس لئے ذرا دیر سے گھر جاؤں گا۔"

"اچھا میں شام کو فون کروں گی۔" عذرا نے کہا۔

"آپ رات تک کیجئے گا ممکن ہے میں شام کو بھی گھر میں نہ ہوں۔" نور نے جواب دیا۔

انہوں نے رات دس بجے فون کیا۔ فون پھر نور نے ریسو کیا اور افسوس سے بولا۔ "امی موبائل کی بیٹری کا چارج ختم ہو رہا ہے کسی وقت بھی جواب دے سکتی ہے، میں اسے چارجر پر لگا رہا ہوں۔ آپ ایسا کریں سدرہ سے صبح بات......" اس کے ساتھ لائن ڈراپ ہوگئی۔ شاید بیٹری کمزور پڑ گئی تھی۔ وہ افسردہ ہوگئیں۔ کتنا دل چاہ رہا تھا۔ سدرہ سے بات کرنے کو...... خیر صبح ہی سہی۔ انہوں نے خود کو تسلی دی۔ ویسے بھی رات کے وقت نئے شادی شدہ جوڑوں کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوتا۔

اگلے روز صبح اٹھ کر انہوں نے سب سے پہلے نور کے موبائل پر کال کی مگر جواب نہیں مل رہا تھا۔ وہ ذرا پریشان ہوگئیں۔ انہوں نے گھر کے نمبر پر بھی کوشش کی مگر بیل بجتی رہی کسی نے اٹھایا نہیں۔ دوپہر تک کوئی جواب نہیں ملا تو وہ پریشان ہو کر مصباح کا نمبر ملانے لگیں۔

"ان کے گھر سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔ نور کے موبائل سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا۔ میرا دل گھبرا رہا ہے، تم نسیم سے کہو کہ ذرا پتا کرلے۔ نہ جانے کیا بات ہے۔"

"امی آپ فکر نہ کریں۔" مصباح نے انہیں تسلی دی۔ ایسی چھوٹی موٹی باتیں ہو جاتی ہیں۔ میں نسیم سے کہتی ہوں وہ جا کر دیکھیں گے۔ آپ پریشان مت ہوں۔"

مصباح نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ سدرہ کی خیریت معلوم کرے۔ اس کے گھر سے کوئی رابطہ نہیں ہو رہا ہے اور امی پریشان ہیں۔ نسیم اسپتال کی ڈیوٹی سے آیا تھا۔ بادل نخواستہ وہ بیگم کی فرمائش پر روانہ ہوا۔ اس نے کار اپارٹمنٹ کے سامنے روکی۔ نیچے بنی دکانوں میں سے ایک تو کھل گئی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا اس نے اپارٹمنٹ کی کال بیل بجائی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ گھنٹی بجائی اور پھر بجاتا چلا گیا بعد میں اس پر واضح ہوا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ اس نے سوچا کہ شاید وہ سب کہیں گئے ہوئے ہیں۔ وہ واپسی کے لئے پلٹ رہا تھا کہ اوپر سے ایک شخص اترا اور اس کے پاس آکر رکا۔

"جناب آپ شاید نہیں جانتے یہ لوگ فلیٹ خالی کر کے جا چکے ہیں۔"

"کب؟" نسیم دنگ رہ گیا تھا۔

"جی۔ کل صبح سے یہ لوگ سامان لے جا رہے تھے اور رات تک سارا فلیٹ خالی کر دیا تھا۔"

"میرے خدا یہ کیا چکر ہے۔" ڈاکٹر نسیم بے حد فکر مند ہو گیا تھا۔ اس لمحے اسے لگا جیسے فلیٹ کے اندر سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی ہو۔ اس نے بے تابی سے دروازہ بجایا۔

"اندر کوئی ہے۔" کراہنے کی آواز اس مرتبہ بہت واضح تھی۔ نسیم نے اضطراب سے پڑوسی سے کہا۔ "اندر کوئی ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے پلیز کچھ کریں۔"

"میں...... میں کیا کر سکتا ہوں۔" پڑوسی بوکھلا کر بولا۔

انہوں نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور پھر سب نے فیصلہ کر کے دروازہ توڑ دیا۔ نسیم نے انہیں اطمینان دلایا تھا کہ فلیٹ کے مالک کا ہر نقصان وہ پورا کرے گا، وہ سب سے پہلے اندر گیا اور پھر اس کمرے میں قدم رکھتے ہی اسے سکتہ سا ہو گیا تھا، کمرہ بالکل خالی تھا جو کل تک حجلہ عروسی بنا تھا اور اس کے ننگے فرش پر سدرہ برے حال میں پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ پیر بندھے تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور وہ جیسے غنودگی میں تھی۔ نسیم نے تیزی سے اس کا معائنہ کیا اور اسے جاننے میں دیر نہیں لگی کہ سدرہ پر خاصا تشدد ہوا تھا۔ فلیٹ میں سوائے اس کے ایک تنکا بھی نہیں تھا۔

ڈاکٹر نسیم کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ پھر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے وہاں موجود لوگوں سے کہا۔ "پلیز آپ لوگ یہاں سے جائیں اور ہو سکے تو کسی خاتون کو بھیج دیں۔" پھر اس نے درخواست کی۔ "مہربانی کر کے کوئی پولیس اور ایمبولینس کے لئے فون کر دے۔"

پولیس کا نام سنتے ہی وہاں سے لوگ کھسکنے لگے۔ نسیم نے خود اپنے موبائل سے ایک نزدیکی ایمبولینس سروس سینٹر فون کیا اور ان سے ایمبولینس بھیجنے کو کہا۔ کوئی عورت نہیں آئی تھی اس لئے وہ خود سدرہ کے پاس موجود رہا۔ وہ غشی کی کیفیت میں کبھی کبھی کراہ اٹھتی تھی۔ ایمبولینس کے سائرن کی آواز سن کر اس نے ایک آدمی سے درخواست کی طبی عملے کو اسٹریچر سمیت اوپر لے آئے۔ اس کے پاس کار تھی اور وہ چاہتا تو سدرہ کو خود اسپتال لے جانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن مقامی لوگوں کی وجہ سے اس نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ یہ بات تو صاف تھی کہ نور احمد اور اس کے گھر والے فراڈ تھے اور شادی کے نام پر دھوکا دے کر بھاگ گئے تھے۔ راستے میں اس نے فون کر کے مصباح کو مختصر الفاظ میں صورت حال بتائی تو وہ رونے لگی تھی۔

"رومت" اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "جا کر امی کو تسلی دو۔ میں سدرہ کو لے کر گھر آؤں گا۔ اس وقت تک انہیں تسلی دو۔" پھر اس نے ایک واقف کار انسپکٹر سے رابطہ کیا اور اسے صورت حال بتائی۔ "پہلے وہاں کسی موبائل کو بھیجو ہو سکتا ہے ان لوگوں کا کوئی سراغ ملے۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" انسپکٹر نے اسے تسلی دی۔ "لیکن لڑکی کا بیان اور میڈیکل رپورٹ ضروری ہے۔"

"میں اس کا خیال رکھوں گا۔" ڈاکٹر نسیم نے جواب دیا۔ وہ سدرہ کو اپنے ایک جاننے والے کے اسپتال لے گیا تھا۔ کوئی عام سرکاری اسپتال پولیس کے بغیر اس کیس کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ ڈاکٹر نے سدرہ کو طبی امداد دی۔ وہ شاک کی کیفیت میں تھی اس لئے ڈاکٹر نے اسے انجکشن دے کر سلا دیا۔

طبی معائنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ دو یا زیادہ افراد نے زیادتی کی ہے۔ نسیم کے لئے یہ انکشاف افسوسناک تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ اس بات کو راز میں رکھا جائے ورنہ سدرہ کی بدنامی ہوگی۔

فی الحال سدرہ کو اسپتال سے لے جانا ممکن نہیں تھا اس لئے نسیم نے اپنے جاننے والے انسپکٹر کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ ایک پارٹی فلیٹ تک گئی تھی، وہاں انہیں کوئی نشان نہیں ملا۔ ارد گرد کے لوگوں سے جو پوچھ گچھ ہوئی اس کے مطابق وہ ان لوگوں کو نہیں جانتے اور نہ ہی کسی کو یہ معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے۔ نیچے دکان والوں کے بیان کے مطابق منہ اندھیرے ایک ٹرک آیا جس کے ساتھ چار پانچ مزدور بھی تھے، انہوں نے سامان اوپر سے لا لا کر ٹرک میں بھرنا شروع کیا، اس میں شفیع احمد کا بیٹا بھی سرگرم تھا، جس کا نام نور احمد تھا، ٹرک نے دو چکر لگائے اور سارا سامان لے گیا۔ کسی نے ٹرک کا نمبر نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

سدرہ کو آٹھ گھنٹے بعد ہوش آیا تو اس نے روتے ہوئے اپنی بربادی کی داستان سنائی۔ یہ اتنی اندوہناک روداد تھی کہ بیان لینے والے اے ایس آئی کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔

کوشش کی وجہ سے اخبارات میں اس کیس کا چرچا نہیں آ سکا تھا لیکن پھر بھی عذرا کے خاندان اور جاننے والوں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی تھی۔ سدرہ لٹی پٹی گھر آگئی تھی۔ ان لوگوں نے صرف پیسہ اور سامان ہی نہیں لوٹا تھا اس کی روح بھی چھین لی تھی۔ وہ جیسے زندہ لاش بن کر رہ گئی تھی۔

پولیس نے دکان پر بھی چھاپہ مارا لیکن وہ خالی نکلی تھی۔ دو دن پہلے جب چھٹی کی وجہ سے مارکیٹ بند تھی۔ نور احمد سوزوکی لایا اور اس میں سارا کپڑا اور دوسرا سامان بھر کر لے گیا۔ پتہ چلا کہ اس نے دو مہینے سے دکان کا کرایہ دیا تھا اور نہ ہی بجلی کا بل ادا کیا تھا۔ ان لوگوں نے کئی مہینے سے فلیٹ کا کرایہ بھی نہیں دیا تھا اور نہ ہی بل وغیرہ ادا کئے تھے۔

عذرا غم سے بے حال تھیں۔ انہیں چار لاکھ اور سامان کے جانے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ افسوس یہ تھا کہ انہوں نے اپنی بچی ایسے درندوں کے حوالے کر دی تھی جنہیں رشتوں کا پاس ہی نہیں تھا۔ سدرہ نے بتایا کہ جب وہ گھر پہنچی تو وہاں سامان باندھا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کچھ پوچھتی نور نے اچانک اس کی ناک پر ایک کپڑا رکھ دیا جس سے انتہائی تیز بو نے اسے لمحوں میں ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

نہ جانے وہ کتنی دیر بے ہوش رہی۔ پھر اسے ذرا ہوش آیا ہی تھا کہ اسے پھر وہ دوا سنگھا دی گئی اس کے اثر سے وہ دوبارہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ اسے دو تین بار ہوش آیا اور ہر بار اسے پھر بے ہوش کر دیا گیا تھا۔

جب اسے مکمل طور پر ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ پولیس نے اس کا بیان لیا تھا۔ ڈاکٹر نسیم نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا جس کی وجہ سے پولیس نے ان دھوکے بازوں کی تلاش میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ فلیٹ کے مالک، اسٹیٹ ایجنٹ اور دکان کے مالک کو حراست میں لے لیا گیا، ان سے پوچھ گچھ کی گئی لیکن وہ بے گناہ ثابت ہوئے اس لئے انہیں رہا کرنا پڑا تھا۔

فراڈ لوگوں نے اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا حتیٰ کہ شادی کے موقع پر جو تصاویر لی گئی تھیں وہ بھی بہانے سے نور لے گیا تھا، ساتھ ہی نیگیٹو بھی۔ اب ان کے پاس کوئی تصویر نہیں تھی۔ جو پولیس کو دی جا سکتی۔ حلیہ سن کر پولیس کے ماہرین نے تصویر بنائی تھی لیکن اس حلیے کے مطابق کوئی مجرم ان کے ریکارڈ میں نہیں تھا، جب کوئی سراغ نہیں ملا تو پولیس نے بالآخر کیس داخل دفتر کر دیا۔

☆......☆......☆

محمود نے چونک کر سر اٹھایا۔ یہ کیس اتنا دلچسپ تھا اور پھر تفتیشی افسر نے اپنا زور قلم اس طرح صرف کیا تھا کہ یہ ایک کیس کی رپورٹ سے زیادہ کوئی کہانی محسوس ہونے لگی تھی۔ محمود علی نے محسوس کیا کہ یہ کیس اس کے مطلب کا تھا۔ اسے بھی معاشرے کے ان ناسوروں سے شدید نفرت تھی جو عام اور بھولے بھالے لوگوں کو دھوکا دیا کرتے تھے۔ انہیں نقصان پہنچاتے اور لوٹ لیا کرتے تھے اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان لوگوں کا انداز پیشہ ور دھوکے بازوں کا سا تھا۔ ان دھوکے بازوں نے ایک ایک چیز کا خیال رکھا تھا اور اپنی کوئی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دی تھی۔ آخر میں انہوں نے جس بے دردی سے انسانیت کی دھجیاں اڑائی تھیں، اس سے ظاہر تھا کہ وہ کسی قسم کی اقدار پر ذرا بھی یقین نہیں رکھتے تھے۔ ان کی حالت جانوروں کی سی تھی جو محض اپنے مفاد سے غرض رکھتے ہیں۔ یہ کمزوروں کا خون پینے والے درندوں کی طرح شاطر اور ان جیسی سرشت رکھنے والے مجرم تھے۔ انہوں نے اپنے خون خوار چہروں پر خول چڑھا رکھے تھے۔

چھٹی کا وقت ہو رہا تھا، اس لئے محمود علی نے فیصلہ کیا کہ باقی فائل گھر لے جا کر پڑھے گا۔ اس نے فائل ساتھ لے لی۔ اس کا گھر گلشن اقبال میں تھا۔ گویا واردات اس کے علاقے میں ہی ہوئی تھی لیکن اس وقت اس کی تعیناتی صدر کے ایک تھانے میں تھی، اس لئے اس کیس سے اس کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ گھر میں ماں نے اس کی پیشانی چوم کر اس کا استقبال کیا۔ جسٹس صاحب مغرب پڑھنے قریبی مسجد میں گئے تھے۔ ماں نے کہا۔ "بس اب تو شادی کے لئے ہاں کر دے۔ مسعود اور میمونہ کے بچے میں نے کھلا لئے اب تیرے بچے کھلانا چاہتی ہوں۔"

"بس امی کچھ عرصے اور۔" اس نے التجا کی اس دوران اس کی بھابھی تحریم اس کے لئے چائے لے آئی تھیں۔

انہیں معلوم تھا کہ دیور کو گھر میں گھستے ہی چائے کی طلب ہوتی تھی۔ اس نے پیالی لی اور بولا۔ "جیو بھابھی...... بھابھی ہو تو ایسی۔"

"مسکا نہیں۔ امی کی بات مان لو اور فوراً ایک چائے پیش کرنے والی لے آؤ۔"

"کوئی بھی آجائے۔ بھلا آپ کے ہاتھ کی چائے کا مزہ کسی اور کی چائے میں کہاں ہوگا۔" اس نے کہا اور مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے کمرے میں آکر ایک بار پھر فائل سنبھال لی ابھی اس میں کئی دلچسپ کیسز اور بھی تھے جن کی کڑیاں ایک ہی گروہ کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

☆......☆......☆

مغرب کی نماز کے وقت مسجد میں ایک نئی شخصیت کو دیکھ کر خاصے لوگ چونک گئے تھے سر پر سفید صافہ باندھے اور چہرے پر سفید داڑھی اس کی شخصیت میں بڑی جاذبیت تھی۔

مغرب کے بعد ایک صاحب ان کے پاس گئے۔ "جناب کا تعارف......"

وہ کچھ وظائف پڑھ رہا تھا، ان سے فارغ ہو کر اس نے آرام سے جواب دیا۔ "احقر کو نذر حسین کہتے ہیں، حال ہی میں اس علاقے میں اپنے خاندان کے ہمراہ آیا ہوں۔"

ذرا سی دیر میں لوگ اس سے گھل مل گئے۔ اس کے بولنے کا انداز بڑا دلنشیں اور باتیں سیدھی دل میں اتر جانے والی تھیں۔ اسے مذہب کے بارے میں وسیع معلومات تھیں۔ جب وہ جانے لگا تو کئی افراد نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ علیرشی کے پاس جامعہ ملیہ روڈ پر نسبتاً پوش آبادی تھی۔ یہ شخص اس آبادی کے ایک بنگلے میں آیا تھا۔ دو سو گز پر بنے اس خوبصورت بنگلے کو اس نے اندر سے اچھے سامان سے آراستہ کیا، اس کے ساتھ اس کی بیوی اور نوجوان بیٹا عباس تھا، وہ ایک سرکاری ادارے میں انجینئر تھا۔ روزانہ صبح سویرے ڈیوٹی پر جاتا اور شام کو اس کی واپسی ہوتی تھی۔ اہل محلہ نے چند دن میں اس گھرانے سے تعلقات قائم کر لئے تھے۔ اس میں بڑی حد تک دخل ان لوگوں کے خلوص اور گرمجوشی کا تھا۔ نذر کی بیوی فاطمہ سادہ لیکن ملنسار عورت تھی، ہر روز کسی نہ کسی کے ہاں جاتی اور کھانے کی کوئی نہ کوئی شے ضرور لے جاتی۔ اس کے گھر میں بھی محلے کی خواتین جاتی تھیں۔ ان کی خوب خاطر تواضع ہوا کرتی تھی۔ خاتون خاصی مذہبی تھیں اور جب وہ بات کرتیں تو خواتین شوق سے سنا کرتی تھیں۔ ان کے رہن سہن، گھر کے فرنیچر اور دیگر سامان سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ خاصے پیسے والے ہیں۔ نذر نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ شیئرز کا کام کرتا ہے۔ روزانہ دو تین گھنٹے کے لئے اسٹاک ایکسچینج جاتا تھا۔ اس کام سے اسے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ وہ آرام سے اپنی گزر بسر کر سکتے تھے۔ بقول اس کے اس کے بیٹے عباس کی اچھی خاصی تنخواہ تھی جسے وہ جمع کرتے تھے تاکہ اس کی شادی کے وقت کام آئے۔ فاطمہ نے محلے کی عورتوں سے کہا کہ اگر کوئی بڑی کمیٹی پڑ رہی ہو تو اسے بتائیں، وہ پانچ ہزار روپے ماہانہ کی کمیٹی آرام سے ڈال سکتی ہے۔

اتفاق سے محلے کی ایک عورت جو کمیٹیاں ڈالا کرتی تھی اس نے اس مہینے سے دو ہزار سے پچاس ہزار کی کمیٹی شروع کی تھی۔ فاطمہ نے اس کے ہاں تین کمیٹیاں ڈال لیں۔ اسے چوتھا...... تیرھواں اور بائیسواں نمبر ملا تھا۔ ایک مہینے کے اندر یہ خاندان سارے اہل محلہ سے اس طرح گھل مل گیا تھا جیسے برسوں پرانی جان پہچان ہو۔

وہ جس بنگلے میں آئے تھے اس کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا کہ اسے انہوں نے خرید لیا ہے۔ بنگلے کا سابق مالک ملک سے باہر تھا اس لئے کوئی تصدیق نہیں کر سکتا تھا کہ بنگلہ انہوں نے خریدا تھا یا نہیں۔ اس محلے میں ایک صاحب ظفر مہدی رہا کرتے تھے، ان کی لانڈھی کے صنعتی علاقے میں ایک چھوٹی سی ڈائنگ فیکٹری تھی۔ یہاں کپڑا رنگنے کا کام ہوتا تھا۔ کروڑ پتی شخص تھے چھ سو گز کے بنگلے میں اپنی بیوی اور تین بیٹیوں سمیت رہا کرتے تھے۔ ایک ہی بیٹا تھا جو امریکا چلا گیا تھا۔ ظفر مہدی کی سب سے بڑی بیٹی شیما بائیس سال کی ہو رہی تھی۔ خاصی قبول صورت اور پہننے اوڑھنے کے معاملے میں باذوق لڑکی تھی، اس کے کئی رشتے آئے تھے لیکن ظفر مہدی کے معیار پر کوئی پورا نہیں اترا تھا۔ اس لئے شیما ابھی تک گھر میں بیٹھی تھی۔ ایک سال پہلے اس نے گریجویشن کیا تھا۔

شیما سے تین سال چھوٹی قرۃ العین تھی جو ابھی گریجویشن کر رہی تھی اور اس سے دو سال چھوٹی تبسم فرسٹ ایئر میں تھی۔ شیما کی نسبت دونوں بہنیں خاصی خوبصورت تھیں، خاص طور سے قرۃ العین کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ اس کے رشتے آنے شروع ہو گئے تھے اور ان میں کئی اچھے رشتے تھے، خاص طور سے ظفر کے ایک دوست رفیق کے بیٹے محمد علی کا رشتہ سب کو پسند آیا تھا۔ لڑکا باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا۔ اس نے ایم بی اے کیا تھا۔ صورت شکل کا بھی اچھا تھا۔ ظفر اسے بچپن سے دیکھتا آیا تھا اور اس کے خیال میں قرۃ العین کے لئے یہ آئیڈیل رشتہ تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی بیوی عطیہ پرانے خیالات کی تھی اس کا کہنا تھا کہ پہلے بڑی کی شادی ہوگی تب وہ چھوٹی کی شادی کریں گی۔

ظفر مہدی نے انہیں سمجھایا۔ "عطیہ اب دور بدل چکا ہے بیٹیوں کے لئے اچھے رشتوں کا کال پڑا ہے، دیکھو خدا کے فضل سے سب کچھ ہے لیکن شیما کے لئے ایک اچھا رشتہ نہیں آیا ہے۔ اب قسمت کہ ہمیں رفیق جیسا شخص مل رہا ہے تو ہم اس فضول سی بات پر رشتہ گنوا دیں کہ پہلے بڑی کی کرنا ہے۔"

"آپ نہیں جانتے...... میں بلاوجہ ضد نہیں کر رہی ہوں۔" عطیہ نے شوہر کو سمجھایا۔ "اگر ہم نے پہلے چھوٹی کی شادی کر دی تو اس سے یہ تاثر پھیلے گا کہ ہم بڑی کی شادی کرنا نہیں چاہتے یا اس میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔ اس کے جو رشتے آرہے ہیں وہ بھی آنے بند ہو جائیں گے۔ شیما ساری عمر کے لئے بیٹھی رہ جائے گی۔

"بھئی جیسی تمہاری مرضی۔" ظفر مہدی نے بیزاری سے کہا۔ "میں قرۃ العین کے لئے آنے والا رشتہ گنوانا نہیں چاہتا۔"

"آپ ان سے کہیں کہ ابھی بات طے کر دیتے ہیں۔ رشتہ ہم بڑی کے بعد ہی کریں گے۔"

"ہاں یہ بات میں کر سکتا ہوں۔" ظفر نے کچھ سوچ کر کہا تھا۔ "میں کل ہی رفیق سے بات کرتا ہوں۔"

ظفر نے اپنے دوست سے بات کی اور یوں قرۃ العین کا رشتہ محمد علی سے طے ہو گیا۔ ان کی منگنی کر دی گئی تھی اور طے ہوا کہ جب قرۃ العین گریجویشن کر لے گی تو شادی کر دی جائے گی۔

شیما یہ سب دیکھ کر اندر سے کڑھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جب اس سے معمولی صورت رکھنے والی اور کہیں غریب گھرانوں کی لڑکیاں کم عمری میں بیاہ جاتی ہیں تو اب تک اس کا کوئی معقول رشتہ کیوں نہیں آیا۔ بیس سال کی عمر تک اس کا جسم کسی قدر بھاری تھا لیکن اس نے باقاعدگی سے ورزش کر کے خود کو سڈول اور اسمارٹ کر لیا تھا۔ گریجویشن کے بعد وقت گزاری کے لئے اس نے چائنیز کھانے بنانے کے ایک کورس میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ ادارہ شارع فیصل پر تھا، شیما روزانہ ایک گھنٹے کی کلاس جا کر لیا کرتی تھی۔ ظفر نے گھر میں دو گاڑیاں رکھی تھیں، ایک اس کی اپنی ہنڈا سوک تھی اور دوسری گھر والوں کے لئے چھوٹی نسان سنی کار تھی۔ شیما کو ڈرائیونگ آتی تھی اور یہ کار زیادہ تر اس کے استعمال میں رہا کرتی تھی۔

اس روز وہ جانے کے لئے نکلی تو اپنے گھر کے سامنے موٹر سائیکل کی صفائی کرتا نوجوان بے دھیانی میں اس کی کار کے سامنے آگیا۔ اس نے بالکل غیر متوقع حرکت کی تھی اس لئے شیما بروقت کار نہ روک سکی اور نوجوان کو ہلکی سی ٹکر لگی۔ وہ جھٹکے سے زمین پر جا گرا جب بوکھلائی ہوئی شیما کار سے نکلی تو وہ کراہتا ہوا زمین سے اٹھ رہا تھا۔

سوری...... ویری سوری...... میں بروقت کار نہ روک سکی۔ آپ کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی ہے؟"

نوجوان نے شارٹ پہن رکھا تھا۔ شیما نے دیکھا اس کے گھٹنے سے خون بہہ رہا تھا اور ہلکی سی سوجن بھی آگئی تھی لیکن اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "فکر مت کریں۔ میں ٹھیک ہوں غلطی میری تھی مجھے یوں دیکھے بغیر پیچھے نہیں ہٹنا چاہئے تھا۔"

"آپ کا گھٹنا زخمی ہے۔ دیکھیں خون بہہ رہا ہے۔"

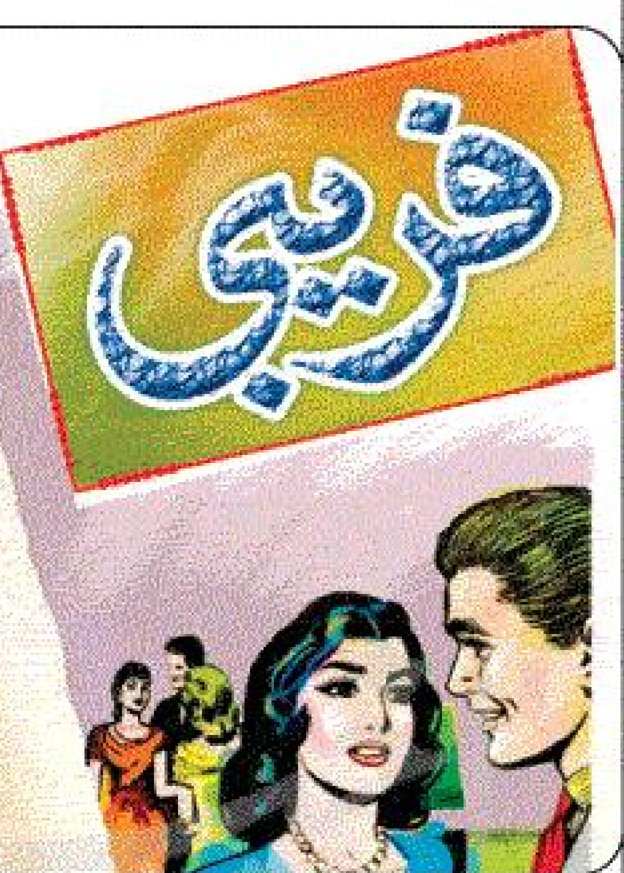
"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ معمولی سی چوٹ ہے ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے تسلی دینے والے انداز میں کہا مگر اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اسے خاصی تکلیف ہے۔

"پلیز تکلف مت کریں۔ پاس ہی میرے ایک جاننے والے ڈاکٹر کا کلینک ہے میں آپ کو وہاں لے چلتی ہوں۔"

غرض کہ شیما نے اصرار کیا تو وہ گھٹنے پر رومال باندھ کر اس کے ساتھ کار میں آبیٹھا تھا۔ شیما اسے کلینک لے آئی ڈاکٹر نے معائنہ کیا پٹی کی اور ایک ٹی ٹی کا انجکشن لگا دیا تھا۔ اس دوران شیما اپنے ڈاکٹر کو بتاتی رہی تھی کہ یہ حادثہ کیوں کر پیش آیا تھا۔ پٹی کروا کے وہ اصرار کر کے نوجوان کو گھر تک چھوڑنے آئی تھی۔ راستے میں تعارف ہوا۔ نوجوان نے اپنا نام عباس بتایا اور یہ بھی کہ وہ انجینئر ہے۔ شیما نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ گریجویشن کر چکی ہے اور ان دنوں چائنیز کوکنگ کی کلاس لے رہی ہے۔ عباس نے ہنس کر کہا۔

"میں چائنیز کھانوں کا دیوانہ ہوں مگر بدقسمتی سے امی کو چائنیز بنانا بالکل نہیں آتا۔ مجھے اپنا شوق باہر جا کر پورا کرنا پڑتا ہے۔"

(جاری ہے)





شیما کو ہلکی بھوری آنکھوں، کھڑے نقوش اور پرکشش سانولی رنگت والا یہ نوجوان اچھا لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ خاندان محلے میں مہینے بھر پہلے ہی آیا تھا اور ان کی سب ہی تعریف کرتے تھے۔ عباس کی والدہ دو تین باران کے ہاں آ چکی تھیں۔ شیما کو محلے والوں سے میل جول سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، اس کی زیادہ تر فرینڈز محلے سے باہر کی تھیں اور اس کے ساتھ کالج میں تعلیم حاصل کرتی رہی تھیں۔ اس کا محلے کی دو تین لڑکیوں کے گھر آنا جانا تھا۔ گھر آ کر اس نے ماں کو بتایا تو وہ پریشان ہوگئی تھی۔ "لڑکی تو نے اسے زیادہ زخمی تو نہیں کر دیا؟"

"امی! اس کے گھٹنے پر ہلکی سی چوٹ آئی تھی۔" اس نے اطمینان دلایا۔

"میں آج رات دیکھنے جاؤں گی، ان سے معذرت بھی کروں گی۔"

"آپ دیکھنے جائیں لیکن معذرت کی ضرورت نہیں ہے، میں نے خود اس سے خاصی معذرت کر لی ہے، وہ اچھا شخص ہے، کوئی اور ہوتا تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔"

ماں، بیٹی کے لہجے سے کھٹک گئی تھی۔ اس سے پہلے شیما نے کبھی کسی لڑکے کا اس انداز میں ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ اس سے متاثر لگ رہی تھی۔ اسی شام جب وہ نذر حسین کے ہاں گئی تو اس کی بیوی نے گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ "زہے نصیب...... آج تو آپ بھی راستہ بھول گئیں۔"

عطیہ کھسیا گئی تھی۔ "معاف کیجئے گا مسز نذر......! دراصل مصروفیت کی وجہ سے میرا محلے میں نکلنا کم ہوتا ہے، پر آج شیما نے آ کر بتایا تو میں رہ نہ سکی، اب عباس بیٹے کا کیا حال ہے؟"

"اسے کیا ہوا؟" مسز نذر نے حیرت سے کہا۔ "اچھا بھلا تو ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو نہیں پتا؟" عطیہ نے غور سے انہیں دیکھا۔ "شیما کار لے کر باہر جا رہی تھی کہ عباس سامنے آ گیا، اس کے گھٹنے پر خاصی چوٹ آئی ہے، شیما ہی مرہم پٹی کروا کے لائی تھی۔"

"اچھا!" مسز نذر پریشان ہوگئی تھیں۔ "اس نے گھر میں تو نہیں بتایا۔"

مسز نذر بیٹے کے کمرے تک گئیں پھر کچھ دیر بعد آئیں تو ان کے چہرے پر اطمینان تھا۔ "خدا کا شکر ہے، زیادہ چوٹ نہیں آئی، آپ شیما بیٹی کا شکریہ ادا کر دیجئے گا کہ اس نے خود کلینک لے جا کر پٹی کروا دی ورنہ یہ اتنا بے پروا لڑکا ہے کہ گھر میں نہ تو بتاتا اور نہ خود پٹی کرواتا۔"

عطیہ شرمندہ ہوگئی۔ "ارے نہیں مسز نذر! شکریہ کس بات کا......! شیما تو شرمندہ ہو رہی تھی۔"

"اسے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" مسز نذر بولیں۔ "عباس بتا رہا ہے غلطی اسی کی ہے، وہ بے دھیانی میں پیچھے ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے ہلکی سی ٹکر لگی تھی، وہ تو شیما بیٹی نے بروقت بریک لگا دیا جس کی وجہ سے کوئی حادثہ رونما نہیں ہوا تھا۔"

مسز نذر نے عطیہ کی خاطر تواضع کی تھی اور جب وہ وہاں سے اٹھی تو دونوں گھرانوں کے تعلق میں ایک نیا رخ آ چکا تھا۔ عطیہ نے عباس کو دیکھا تھا، وہ خوبرو اور مہذب نظر آنے والا لڑکا تھا۔ اس نے مسز نذر کو کریدا کہ عباس کی کہیں بات طے تو نہیں ہوئی یا وہ کسی لڑکی میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ مسز نذر نے کہا تھا۔ "بہن! رشتے کی تو فکر ہے لیکن آج کل جیسے ڈھنگ کے رشتوں کا کال پڑ گیا ہے، دراصل ہم لوگ سید ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی ہم پلہ گھرانے میں رشتہ ہو، چلیں اگر سید نہ ہوں تب بھی اعلیٰ نصب تو ہوں۔"

"سید تو ہم بھی ہیں۔" عطیہ نے کہا۔ "لیکن رشتوں کے معاملات میں آج کل اتنا کون دیکھتا ہے، میری چھوٹی بیٹی کا رشتہ ایک غیر سید خاندان میں ہوا ہے، لوگ اچھے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا چاہئے۔"

"آپ نے شیما کی بات کہیں طے نہیں کی ہے؟" مسز نذر نے تجسس سے پوچھا۔

"بس بہن...... رشتے تو کئی آئے لیکن شیما کے ذرا نخرے ہیں، بس اسی وجہ سے کہیں اس کی بات طے نہیں ہو سکی ہے۔"

مسز نذر حسین نے معنی خیز نظروں سے عطیہ کی طرف دیکھا۔ "لگتا ہے یہ حادثہ بے سبب نہیں ہے۔"

عطیہ نے حوصلہ افزا انداز میں جواب دیا۔ "اللہ بہتر ہی کرتا ہے، آپ چھٹی والے دن بھائی صاحب کے ساتھ ہمارے ہاں آئیں۔"

عطیہ نے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی تھی جو مسز نذر حسین نے قبول کر لی۔ عطیہ نے گھر جا کر بتایا تو شیما خوش نظر آنے لگی۔ "امی! کیا عباس بھی آئے گا؟" اس نے پوچھا۔

"ممکن ہے آئے۔" عطیہ بولی۔ "میں نے سارے گھر کی دعوت کی ہے۔"

بیٹی کی خوشی انہیں بہت کچھ بتا رہی تھی۔ عطیہ، مسز نذر حسین سے ان کے گھر کا نمبر لے آئی تھیں، وہ اس نے باتوں باتوں میں بیٹی کو بتا دیا۔ وہ فوراً اپنے کمرے کی طرف گئی۔ فون کا ایک ایکسٹینشن اس کے کمرے میں بھی تھا، اس نے نمبر ملایا، کال خاتون نے ریسیو کی، اس نے بلا جھجک کہا۔ "آنٹی! میں شیما بات کر رہی ہوں، کیا عباس سے بات کرائیں گی؟"

"کیوں نہیں بیٹی!" مسز نذر حسین نے خوش دلی سے کہا۔ "تم ہولڈ کرو اور ہاں اس کی پٹی کرانے کا شکریہ!"

"شرمندہ مت کریں آنٹی! چوٹ بھی تو میری کار سے آئی تھی۔" وہ ندامت سے بولی۔

"بس بیٹا......! اتنی شرمندگی بھی اچھی نہیں ہوتی، جو ہونا تھا ہو گیا، اب بھول جاؤ، میں عباس کو بلاتی ہوں۔"

کچھ دیر بعد عباس لائن پر تھا۔ "ہیلو......! کیسے یاد کیا؟"

"بس آپ کا حال پوچھنا تھا۔" وہ بولی۔ "اور سوری بھی کرنا تھی۔"

"بس اتنی سوری مت کریں، میں سمجھتا ہوں میرے لئے یہ حادثہ اچھا ہی رہا۔"

"وہ کیسے......؟" شیما نے انجان بن کر پوچھا۔

"وہ ایسے کہ ابھی آپ سے فون پر بات ہو رہی ہے۔"

شیما ہنسی۔ "یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"میرے لئے تو ہے۔" عباس نے بے اختیار کہا تھا۔

"کیوں......! کیا خاص بات ہے؟" شیما شوخی سے بولی۔

عباس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ "کچھ باتیں کہنے کی نہیں محسوس کرنے کی ہوتی ہیں۔"

شیما جھینپ کر خاموش ہوگئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ "آپ سب اتوار کو ہمارے ہاں دعوت پر آ رہے ہیں نا......؟"

"میں شاید نہ آؤں، مجھے اس طرح جاتے ہوئے جھجک سی لگتی ہے پھر امی، ابو تو آپ کے امی، ابو سے بات کرنے میں لگ جائیں گے، میں خواہ مخواہ بور ہوں گا۔"

"میں آپ کو بور نہیں ہونے دوں گی۔" شیما نے بے ساختہ کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ ہمارے ہاں اس طرح کی تنگ نظری نہیں ہے کہ کوئی مہمان آئے تو ہم لڑکیاں اس لئے اس سے دور رہیں کہ وہ مرد ہے اور پھر میں آپ کے لئے خاص چکن فرائیڈ رائس بناؤں گی۔"

"واہ......!" عباس خوش ہو گیا۔ "یہ تو میری فیورٹ ڈش ہے، اب میں آنے کے بارے میں سوچوں گا۔"

"سوچیں گے نہیں، آئیں گے۔" شیما نے اصرار کیا۔

"ٹھیک ہے، بھئی میں آؤں گا۔" اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔

☆......☆......☆

اتوار کو شیما بے حد خوش اور سرگرم نظر آ رہی تھی۔ اس نے ماں سے کہا۔ "امی! میں چکن فرائیڈ رائس بناؤں گی۔"

"بنا لو" عطیہ نے کہا۔ انہیں ذرا حیرت ہوئی کیونکہ گھر میں آئے دن مہمان آتے رہتے تھے لیکن شیما کبھی اتنی خوش ہوتی تھی اور نہ ہی کھانا وغیرہ بنانے میں اتنی سرگرمی دکھاتی تھی۔

کچن میں اپنا کام نمٹا کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ اس نے اپنا ایک اچھا سا سوٹ نکالا تھا، تیار ہو کر اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا، وہ باہر آئی تو نذر حسین اور اس کی بیوی آ چکے تھے لیکن عباس ان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ یکدم بجھ گئی تھی، اس نے بے دلی سے نذر حسین اور اس کی بیوی کو سلام کیا اور نشست گاہ سے نکل آئی۔

قرۃ العین نے اس سے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "کیا ہوا، کوئی آیا نہیں ہے؟"

"بکومت!" اس نے چڑ کر کہا۔ "جا کر مہمانوں کو کولڈ ڈرنکس دو۔"

قرۃ العین منہ بناتی ہوئی چلی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد آ کر اس نے اطلاع دینے کے انداز میں کہا تھا۔ "وہاں تو آنٹی اور انکل کے ساتھ ایک ہینڈسم سا نوجوان بھی بیٹھا ہے۔"

"سچ......!" اس نے بے ساختہ کہا پھر جھینپ گئی۔ "میرا مطلب ہے کون ہے؟"

"ظاہر ہے ان کا بیٹا ہے۔" قرۃ العین نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔

"اچھا تم ذرا کچن دیکھو، میں پوچھ کر آتی ہوں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔" اس نے دھڑکتے دل سے بہن کو کہا۔

"جی ذرا اچھی طرح پوچھ کر آئیے گا۔" قرۃ العین شوخی سے ہنسی۔

شیما نشست گاہ میں آئی تو وہاں عباس کو دیکھ کر اس کے انداز میں مسرت آ گئی تھی۔ "آپ کب آئے؟"

"جی ابھی آیا ہوں۔" عباس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "صبح سے بائیک کا کام کر رہا تھا، ابھی جا کر مکمل ہوا تھا۔"

"اچھا ہوا بیٹی تم آ گئیں۔" عطیہ بولیں۔ "عباس بور ہو رہا تھا، اس سے بات کرو۔"

دونوں مرد اپنی باتوں میں مگن تھے اور خواتین اپنی باتوں میں، اس لئے وہ ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے۔

شیما نے پوچھا۔ "اب چوٹ کیسی ہے؟"

"معمولی سی چوٹ تھی، اب بالکل ٹھیک ہے۔" عباس نے بے پروائی سے کہا۔

"مجھے اپنے کام کے بارے میں بتائیے۔" شیما کے انداز میں اشتیاق تھا۔

عباس مسکرایا۔ "کوئی خاص کام نہیں ہے میرا...... انجینئر ہوں جہاں راکٹ تیار ہوتے ہیں، وہاں کام کرتا ہوں، ڈیوٹی سے آ کر میوزک سنتا ہوں، ہوٹلنگ کرتا ہوں لیکن صرف کھانے پینے کی حد تک، دوست کم ہیں اور جو ہیں، وہ بھی زیادہ تر کام کرنے والے ہیں اس لئے ان سے ہفتے دس دن میں ایک بار ہی ملاقات ہو پاتی ہے۔"

شیما اسے اپنے بارے میں بتانے لگی۔

بزرگ پاس ہی بیٹھے تھے اس لئے دل کی باتیں دل ہی میں رہ گئی تھیں۔ ذرا دیر بعد قرۃ العین نے کھانا لگنے کی اطلاع دی۔ وہ سب کھانے کی میز پر آ گئے۔ شیما کا خیال تھا کہ عباس کھانے کے بعد بھی رکے گا، وہ اسے عقبی حصے میں واقع مختصر سے لان میں موجود اپنے پرندے دکھائے گی لیکن اسے مایوسی ہوئی جب عباس کھانے کے فوراً بعد چلا گیا۔ اسے اپنے کسی دوست کے پاس ضروری کام سے جانا تھا۔

نذر حسین اور اس کی بیوی نے جانے سے پہلے انہیں جوابی دعوت دی جو عطیہ نے قبول کر لی۔ طے ہوا کہ اگلے اتوار کی رات وہ ان کے ہاں جائیں گے۔ نذر حسین اور اس کی بیوی نے زور دے کر کہا کہ بچیوں کو بھی ساتھ لانا ہے۔

"ضرور کیوں نہیں۔" عطیہ معنی خیز انداز میں بولی تھیں۔

اس رات ظفر اور عطیہ کے درمیان اس موضوع پر بات ہوئی۔ عطیہ نے ظفر سے پوچھا۔ "سنیں! یہ عباس کیسا لڑکا ہے؟"

ظفر جو ٹی وی دیکھ رہا تھا، چونکا۔ "کیا مطلب......؟ اچھا لڑکا ہے۔"

"میں شیما کے حوالے سے پوچھ رہی ہوں۔"

ظفر سوچ میں پڑ گیا اور بولا۔ "سوچ لو اجنبی لوگ ہیں، کچھ عرصے پہلے ہی آئے ہیں، ہم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"بھئی اچھے ہیں...... مالی لحاظ سے بھی کمزور نہیں ہیں، لڑکا اچھے عہدے پر ہے، دو میاں، بیوی ہیں، شیما اکیلے راج کرے گی۔"

"بھئی دیکھ لو...... اگر تمہیں مناسب لگے تو بات آگے بڑھانا۔" ظفر جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔

"میں کون سا ابھی رشتہ دینے جا رہی ہوں، ذرا دیکھیں گے، پرکھیں گے، تب ہی بات آگے کریں گے، آپ بھی اس دوران لڑکے کے بارے میں معلومات کریں۔"

ظفر نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی یہ مناسب نہیں ہے، کیا لڑکے کے ماں، باپ نے ایسا کوئی اشارہ دیا ہے؟"

"مسز نذر کھل کر تو نہیں البتہ اشاروں کنایوں میں شیما کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔"

"تب جب تک وہ کھل کر بات نہ کریں، میں لڑکے کے بارے میں انکوائری نہیں کر سکتا۔" ظفر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"اگر یہ رشتہ ہو جائے تو کتنا اچھا رہے گا۔" عطیہ کی آنکھوں میں بیٹی کی شادی کے خواب جاگنے لگے تھے۔ "عباس خوبرو ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، خاندان بھی اچھا ہے، مالی لحاظ سے ہمارے ہم پلہ نہیں ہیں لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے، ہماری شیما کو کوئی کمی نہیں ہوگی، ساری دولت آخر بچوں کی ہی ہے، پھر قرۃ العین کے سسرال والے بھی اصرار کر رہے ہیں، چند ہفتوں بعد اس کے فائنل پیپرز ہیں۔"

ظفر نے پوچھا۔ "کیا رفیق بھائی کی طرف سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

عطیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اشاروں میں کئی بار ذکر کر چکے ہیں کہ بچی کے امتحانات ہوتے ہی وہ اسے بیاہ کر لے جانا چاہتے ہیں، اگر شیما کی بات بھی طے ہو جاتی ہے تو ہم دونوں کے فرائض سے ایک ساتھ سبکدوش ہو جائیں گے۔"

"اب اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔" ظفر نے ناگواری سے کہا۔ "ہم ایسے گئے گزرے نہیں ہیں کہ دونوں بیٹیوں کو الگ الگ دھوم دھام سے نہ بیاہ سکیں۔"

"پھر بھی بیٹیاں ذمہ داری ہوتی ہیں، جتنی جلد رخصت ہو جائیں، اچھا ہوتا ہے، بات امیر غریب کی نہیں ہے۔"

عطیہ نے اصرار کیا تو وہ خاموش ہو گیا تھا۔

آنے والے اتوار کو وہ سب نذر حسین کے ہاں گئے تھے۔ نذر اور فاطمہ نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا خاص طور سے جس طرح فاطمہ نے شیما کو گلے لگا کر پیار کیا تھا، وہ عطیہ سے چھپ نہیں سکا تھا۔ وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی۔ شیما کی نظریں عباس کو تلاش کر رہی تھیں۔ آخر عینی نے پوچھ لیا۔ "آنٹی......! عباس بھائی کہاں ہیں؟"

"بیٹا! وہ اوپر والے کمرے میں ہے، اس نے وہاں اپنی اسٹڈی بنا رکھی ہے، دراصل اسی کے محکمے کا کوئی امتحان ہو رہا ہے، وہ اس کی تیاری کر رہا ہے۔"

"آئیں باجی......! ہم عباس بھائی کے پاس چلتے ہیں۔" قرۃ العین نے بے تکلفی سے بہن کا ہاتھ تھاما۔

شیما نروس ہو گئی۔ آہستہ سے بولی۔ "کہیں انہیں برا نہ لگے۔"

"ارے نہیں بیٹی......!" نذر حسین نے کہا۔ "عباس چھوٹی چھوٹی باتوں کا برا نہیں مانتا، تم دونوں ضرور اس کے پاس جاؤ، ہمیں تمہارے امی، ابو سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

قرۃ العین اور شیما اوپر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فاطمہ نے کہا۔ "ہم نے سوچا ہے کہ عباس کی شادی کے بعد اوپر ایک کمرہ اور بنوا کر ہم میاں، بیوی اوپر چلے جائیں گے پھر ہم اپنا وقت عبادت میں گزارا کریں گے، دنیا کے کام یہ دونوں چلائیں گے۔"

یہ بنگلہ کم رقبے پر بنا ہونے کے باوجود اس طرح بنایا گیا تھا کہ خاصا بڑا اور جدید طرز کا لگتا تھا۔ اس کے نچلے پورشن میں دو بیڈ رومز، ایک ڈرائنگ اور اس کے ساتھ خاصا بڑا ڈائننگ روم تھا جو کچن سے متصل تھا، سامنے والے حصے میں کار پورچ تھا جس کے ساتھ کچی زمین پر بنی کیاریوں نے بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا، اس کیاری میں کچھ فاصلے کے بعد سرو کے اونچے درخت لگے تھے جن کی وجہ سے بنگلے کی دلکشی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اوپر والے حصے میں ٹیرس کے ساتھ ایک کمرہ تھا، عباس نے اسے ہی اپنی اسٹڈی بنا رکھا تھا۔ جب شیما اور عینی اوپر پہنچے تو وہ ایک کتاب میں کھویا ہوا تھا اور قالین پر نوٹس اور خاکے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں صرف ایک ٹیبل اور کرسی کے سوا کچھ نہیں تھا، فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ عباس انہیں دیکھ کر چونکا پھر شیما پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جسے وہ دونوں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی تھیں۔ شیما جھینپ گئی تھی۔

عباس نے کہا۔ "آج تو مجھے اپنی قسمت پر یقین آ گیا۔"

شیما نے عینی کی وجہ سے پوچھا نہیں کہ کیا یقین آ گیا۔ اس نے کہا۔ "سوری سر! ہم نے آپ کو ڈسٹرب کیا شاید بہت مصروف تھے۔"

"ایسی ہزار مصروفیات میں چھوڑ سکتا ہوں۔" عباس والہانہ انداز میں بولا تھا۔ پھر عینی کا خیال کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "میرا مطلب ہے، گھر آئے مہمانوں کے لئے...... مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔"

عینی معنی خیز انداز میں مسکرائی تھی اور شیما سرخ ہو گئی تھی۔ عباس نے کتابیں اور کاغذات سمیٹے۔ "بیٹھیں آپ دونوں۔"

"عباس بھائی! یہ کس قسم کا امتحان ہے؟"

"میرے محکمے کی طرف سے اس قسم کے امتحانات ہوتے رہتے ہیں۔" عباس نے وضاحت کی۔ "ان میں کامیاب ہونے والوں کو ترقی ملتی ہے، اگر میں نے یہ امتحان پاس کر لئے تو میرا عہدہ بڑھ جائے گا، تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگا پھر میں کار لے سکوں گا۔"

"کار لے کر آپ بھلا کیا کریں گے؟" عینی بولی۔ "آپ اکیلے ہیں، آپ کے لئے بائیک بھی کافی ہے۔"

"کبھی نہ کبھی تو کوئی دوسرا آئے گا۔" عباس نے کن انکھیوں سے شیما کی طرف دیکھا۔ وہ پھر شرما گئی تھی۔

"اچھا! آپ دونوں باتیں کریں، میں ذرا نیچے دیکھ آؤں شاید آنٹی کو کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہو۔" عینی بولی اور کمرے سے چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد شیما نروس ہونے لگی تھی۔ عباس نے والہانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ بے تکلفی سے بولا۔

"جی......!" شیما اتنا ہی کہہ سکی۔

حالانکہ وہ قطعی اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ اس کی فرینڈز اس کے اعتماد کی مثال دیا کرتی تھیں لیکن نجانے کیوں اس وقت عباس کے سامنے اس کی ساری خود اعتمادی ہوا ہو گئی۔ وہ اس بری طرح نروس تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اچانک عباس نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بوجھل لہجے میں بولا۔ "شیما! مجھے کہنے دیں، آپ ہمیشہ ہی مجھے اچھی لگیں گی۔"

"سچ......!" اس نے بے ساختہ کہا پھر بری طرح شرما گئی۔

"میں...... تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں، مجھے کسی لڑکی نے آج تک اتنا متاثر نہیں کیا۔" عباس جلدی جلدی کہنے لگا جیسے اسے خوف ہو اس کے الفاظ دل میں رہ جائیں گے، زبان تک نہ آ سکیں گے۔ "شیما! کیا تم میرا ساتھ دو گی؟"

شیما کا سر جھک گیا تھا۔ عباس نے اصرار کیا تو اس نے اپنا لرزتا نازک سا ہاتھ بڑھا کر عباس کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ یہ اس کا خاموش اقرار تھا۔

اس سے پہلے عباس جذبات سے بے قابو ہو کر کوئی حرکت کرتا، دروازے پر آہٹ ہوئی تھی۔ عینی آ گئی تھی۔ شیما نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کیا لیکن عینی دیکھ چکی تھی۔ چھوٹی ہونے کے باوجود وہ ان معاملات میں شیما سے زیادہ تجربہ کار تھی، آخر کار ایک سال سے منگنی شدہ تھی، اس کا منگیتر محمد علی اس کا دیوانہ تھا۔ وہ مسکرانے لگی تو عباس اور شیما دونوں کھسیا گئے تھے پھر شیما سے وہاں بیٹھا نہیں گیا تھا۔ وہ اٹھ کر نیچے آ گئی اور فاطمہ کے ساتھ کھانا بنانے میں ہاتھ بٹانے لگی۔ اس نے ذرا سا کام کیا تھا لیکن فاطمہ نے اسے ڈھیروں دعائیں دے ڈالی تھیں۔

"آنٹی! میں نے کیا کیا ہے؟"

"ماشاء اللہ! بہت سلیقہ مند ہو۔" فاطمہ نے تعریف کی۔ "جس گھر میں جاؤ گی، اسے سجا دو گی۔"

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ عباس آئسکریم لے آیا تھا اور آئسکریم شیما کی جان تھی۔

اس رات گھر آتے ہوئے وہ بے حد خوش تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے عباس کی محبت نہیں ساری دنیا کو فتح کر لیا ہو۔ تقدیر اس پر مہربان تھی۔ جو شخص پہلی نظر میں اسے اچھا لگا تھا، وہ اس کا ہو گیا تھا۔ اسے گنگناتے دیکھ کر عینی معنی خیز انداز میں ہنسی۔

"خیریت! آج تو جناب کے دانت اندر نہیں جا رہے؟"

شیما جھینپی پھر اس نے کہا۔ "آج کی دعوت کتنی اچھی تھی، عباس کے گھر والے کتنے اچھے ہیں۔"

"اور عباس بھائی......؟" عینی نے سوال کیا۔

"وہ بھی...... اچھے ہیں۔" جواب دیتے ہوئے شیما کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

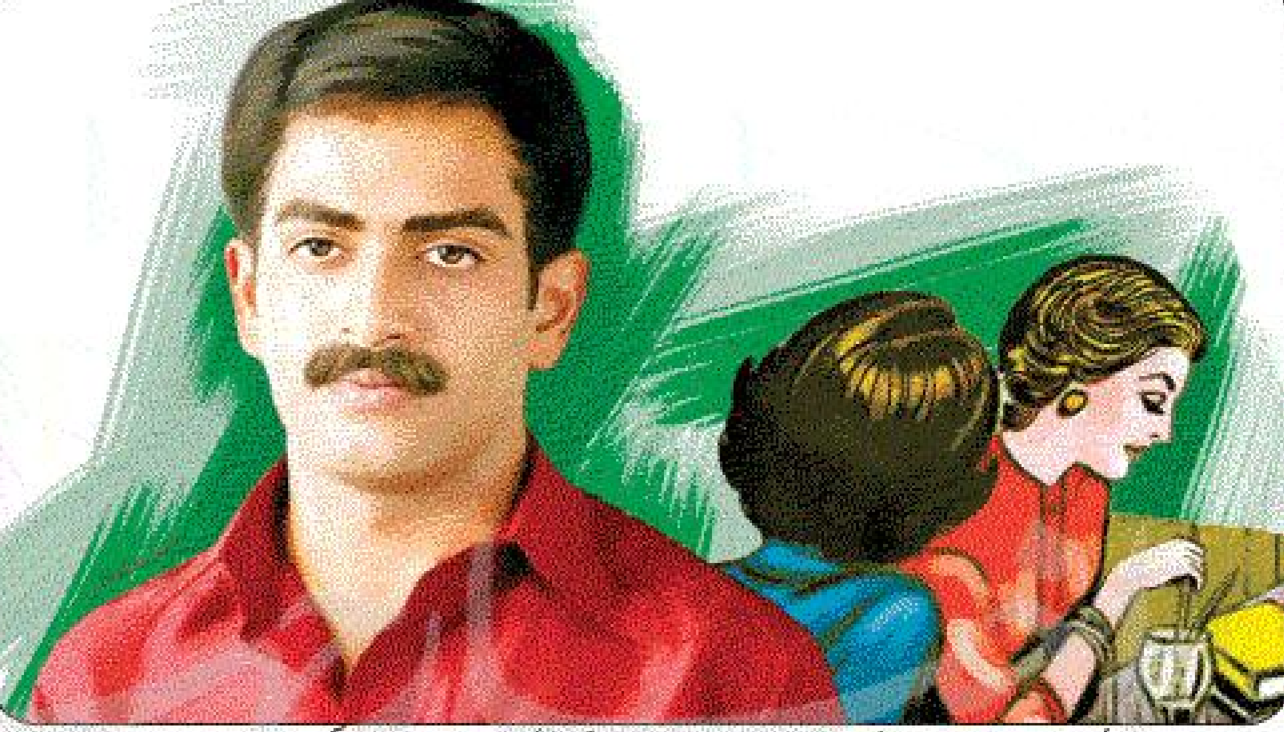
یکدم قرۃ العین سنجیدہ ہو گئی۔ "باجی! کیا عباس بھائی آپ کو اچھے لگتے ہیں؟"

شیما سرخ ہوگئی تھی۔ اس نے جھینپ کر کہا۔ ’’فضول باتیں مت کرو۔‘‘

’’سچ بتایئے۔‘‘ قرۃ العین نے اصرار کیا تو اسے اقرار کرتے ہی بنی تھی۔

’’ہاں وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔‘‘ یہ کہتے ہوئے شیما کا سر جھک گیا تھا۔

قرۃ العین نے پرخیال انداز میں کہا۔ ’’میرا اندازہ ہے کہ یہ بات



ہمارے اور عباس بھائی کے بڑوں کے ذہن میں بھی ہے، آج وہاں اس موضوع پر بات ہو رہی تھی، مجھے دیکھ کر سب چپ ہوگئے تھے لیکن میرے کانوں نے کچھ سن لیا تھا۔‘‘

’’کیا سن لیا تھا؟‘‘ شیما نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

’’فاطمہ آنٹی کہہ رہی تھیں کہ انہیں آپ بہت پسند آئی ہیں۔‘‘ قرۃ العین نے بتایا۔

☆......☆......☆

ادھر ظفر اور عطیہ اپنے بیڈروم میں محوِ گفتگو تھے۔ ’’سچی بات ہے مجھے تو عباس اور اس کے گھر والے بہت اچھے لگے ہیں، ان کے گھر کا ماحول کتنا سلجھا ہوا ہے پھر لڑکا بھی ترقی کرنے کی خواہش رکھتا ہے، ایسے لڑکے آگے جاتے ہیں۔‘‘ عطیہ بولی۔

’’وہ تو ٹھیک ہے۔‘‘ ظفر سوچتے ہوئے بولا۔ ’’لیکن اس قسم کے فیصلے اتنی عجلت میں نہیں کئے جاتے، خاص طور سے اس صورت میں جب اگلا فریق جان پہچان والا بھی نہ ہو۔‘‘

’’اب جان پہچان میں کون سی کسر رہ گئی ہے۔‘‘ عطیہ بولی۔ ’’فاطمہ نے مجھے اپنے بارے میں سب تفصیل سے بتایا ہے۔‘‘

’’کسی کے بتانے اور جاننے میں خاصا فرق ہوتا ہے۔‘‘ ظفر نے کہا۔ ’’ان کے بارے میں انکوائری کروانا پڑے گی، بیٹی کا رشتہ ہے، چھان بین کئے بنا کس طرح دیا جاسکتا ہے؟‘‘

’’یہ اصول تو لڑکے کی شادی پر بھی لاگو ہوتا ہے۔‘‘ عطیہ نے کہا۔ ’’آپ کس طرح انکوائری کروائیں گے؟‘‘

’’سب سے پہلے تو میں عباس کی جاب کے بارے میں کنفرم کروں گا، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لڑکے کی جاب کے بارے میں جھوٹ بولا جاتا ہے کہ وہ افسر ہے حالانکہ وہ کلرک ہوتا ہے، کبھی کبھی تو سرے سے وہاں جاب ہی نہیں کرتا، جہاں کا بتایا جاتا ہے، اس کے بعد دوسری باتیں دیکھی جائیں گی، تم ذرا کرید و کہ ان کے رشتے دار اگر ہیں تو کہاں پر ہیں۔‘‘

’’میں معلوم کرلوں گی۔‘‘

ظفر نے کوشش کی۔ ان کے ایک دور پرے کے رشتے دار اس محکمے کی لیب میں کام کرتے تھے۔ ظفر نے اپنے رشتے دار سے رابطہ کر کے اسے عباس کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے کہا۔ اس نے معلوم کر کے بتایا کہ عباس انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا ہے، اس کی ترقی کے بھی امکانات ہیں۔ اس طرف سے ظفر مطمئن ہوگیا کہ ان لوگوں نے غلط بیانی نہیں کی تھی۔ لڑکا سچ مچ اس سائنسی ادارے میں اچھی پوسٹ پر تھا۔

عطیہ تقریباً روز ہی ان لوگوں کے گھر جاتی تھی یا فاطمہ آجاتی۔ ان دونوں کی آپس میں گاڑھی چھننے لگی تھی لیکن عطیہ جب اس سے ان کے رشتے داروں کے بارے میں پوچھتی، فاطمہ ٹال جاتی تھی۔

ایک روز عطیہ نے زیادہ ہی زور دیا تو فاطمہ نے سرد آہ بھر کر کہا تھا۔ ’’ہمارا اس دنیا میں کوئی رشتے دار نہیں ہے بس ماں، باپ تھے جو گزر گئے، میں بھی ماں، باپ کی اکلوتی تھی اور نذر بھی ایک ہی تھے، ہمارے باپ آپس میں سگے بھائی تھے، دونوں بھائی سارے خاندان کو انڈیا میں چھوڑ کر پاکستان کی محبت میں یہاں چلے آئے تھے، باقی سارا خاندان وہیں رہا، پہلے یہ لاہور میں رہے پھر کراچی آگئے، میری اور نذر کی شادی وہیں ہوئی تھی، بارہ سال پہلے ہمارے ماں، باپ بھی انتقال کر گئے، اب اس شہر میں ہم تین ہی ایک دوسرے کے رشتے دار ہیں۔‘‘ فاطمہ کا لہجہ دکھی ہوگیا تھا۔ ’’عباس بچپن میں کتنا تڑپتا تھا کہ کوئی تو رشتہ دار ہو لیکن اللہ نے اسے رشتے دار تو کیا کوئی اور بہن، بھائی بھی نہیں دیا۔‘‘

فاطمہ کے انداز پر عطیہ کا دل بھر آیا تھا۔ اس نے فاطمہ کو تسلی دی۔ ’’بہن! فکر نہ کرو...... عباس کی شادی کردو، ساری تنہائی خود ہی دور ہو جائے گی...... بیوی سے بڑھ کر کوئی تنہائی بٹانے والا نہیں ہوتا۔‘‘

’’ہاں یہ تو ہے۔‘‘ فاطمہ نے آنکھیں صاف کیں۔ ’’لیکن اتنی جلدی یہ کام کیسے ہوگا، ہم نے ساری رقم جو نذر کو پنشن اور فنڈ کی صورت میں ملی تھی، وہ اس مکان پر لگادی، کچھ رقم سے یہ شیئرز کا کام کرتے ہیں، ابھی شادی کے اخراجات کے لئے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔‘‘

’’آپ فکر نہ کریں...... سب ہوجائے گا۔‘‘ عطیہ نے اسے تسلی دی تھی۔

☆......☆......☆

ایک مہینے بعد ظفر اور عطیہ مطمئن ہوگئے تھے۔ اس لئے انہوں نے نذر حسین اور فاطمہ کو اشارہ دے دیا کہ وہ اپنے بیٹے کا رشتہ لا سکتے ہیں۔ چند دن کے بعد عباس اور شیما کی بات طے ہوگئی۔ اس دوران قرۃ العین کے گریجویشن فائنل کے پرچے ہوچکے تھے، اس کے سسرال والے رخصتی پر زور دے رہے تھے۔ اس لئے عطیہ نے ان سے اصرار کیا کہ وہ شیما کی شادی بھی جلدی کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف بات طے ہوجانے کے بعد نذر حسین اور فاطمہ جیسے سکون سے بیٹھ گئے تھے۔ ایک روز عطیہ خود ان سے ملنے گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں بیٹیوں کی شادی ساتھ کرنا چاہ رہے ہیں اس لئے وہ بھی جلدی کریں۔

’’بہن! ہم کہاں سے جلدی کریں؟‘‘ عطیہ نے کسی قدر روکھائی سے کہا تھا۔ ’’ہمارے پلّے تو کچھ ہے نہیں جو شادی پر لگائیں۔‘‘

’’لڑکے کی کیا تیاری......؟‘‘ عطیہ بولی۔

’’کیوں بری نہیں جاتی...... پھر ولیمہ ہوتا ہے اس کے علاوہ دوسرے اخراجات بھی ہوتے ہیں، بہن! میرا تو ایک بیٹا ہے، اس کی شادی میں دھوم دھام سے نہیں کروں گی تو پھر کس کی کروں گی، میں تو بری بھی بہت شاندار بنانا چاہتی ہوں۔‘‘

عطیہ بے بسی محسوس کرنے لگی تھیں۔ ’’آخر اس میں کتنا عرصہ لگے گا؟‘‘

’’کوئی دو سال تو لگیں گے۔‘‘ فاطمہ نے کہا۔

’’دو سال...... یہ تو بہت ہیں۔‘‘

’’میں نے عباس کی شادی کے لئے چار بڑی کمیٹیاں ڈال رکھی ہیں، یہ دو ہزار سے پچاس ہزار کی ہیں، اگلے دو سال میں یہ نکلیں گی تو میں عباس کی شادی کے قابل ہوسکوں گی۔‘‘

عطیہ مایوس نہیں ہوئی تھی۔ ’’آپ ان کمیٹیوں کی بنیاد پر قرض لے سکتی ہیں۔‘‘

’’کس سے قرض لیں...... ہمارے تو کسی سے ایسے تعلقات بھی نہیں ہیں کہ قرض مانگیں، بینک سے لیں تو ان کی بہت سخت شرائط ہوں گی اور سود بھی دینا پڑے گا۔‘‘

’’ہم دو سال انتظار نہیں کرسکتے، آخر ہمیں چھوٹی کو بھی بیاہنا ہے، اس کے سسرال والے تقاضا کر رہے ہیں۔‘‘

’’آپ اسے رخصت کردیں، شیما کی بعد میں کرتی رہیے گا۔‘‘ فاطمہ نے مشورہ دیا۔

’’نہ بہن...... بڑی کی پہلے نہ سہی...... پر ساتھ تو ضرور کرنی ہے۔‘‘

’’پھر آپ جو مناسب سمجھیں...... اپنی مجبوری تو میں نے بتادی ہے۔‘‘ فاطمہ کے لہجے میں دوبارہ روکھائی آگئی تھی۔

واپس آکر عطیہ نے ظفر کو یہ بات بتائی۔ وہ جھنجلا گیا۔ ’’پہلے تمہیں رشتہ طے کرنے کی جلدی تھی، اب شادی کی جلدی ہے۔‘‘

’’میں دونوں کی شادی ساتھ کروں گی۔‘‘ عطیہ نے ضدی لہجے میں کہا۔ ’’یہ ممکن نہیں ہے کہ چھوٹی کی ہوجائے اور بڑی بیٹھی رہے، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی، لوگ کیا کہیں گے۔‘‘

’’لوگوں کو گولی مارو، اپنی سہولت دیکھو۔‘‘ ظفر نے اسے سمجھانا چاہا۔

مگر عطیہ ضدی عورتوں میں سے تھی جو بات اس کے ذہن میں آجاتی، وہ اسی پر عمل کر کے رہتی تھی۔ اس نے ظفر سے کہا۔ ’’سنیں! نذر بھائی کو بیٹے کی شادی کے لئے دو ڈھائی لاکھ روپے کی ضرورت ہے، ان کی کمیٹیاں کھلنی ہیں، اگر یہ رقم ہم دے دیں تو وہ کمیٹی کھلنے کے بعد ہمیں دے دیں گے۔‘‘

’’تمہارا دماغ درست ہے؟ بیٹی کی شادی کے لئے لڑکے والوں کو رقم ہم دیں گے؟‘‘ ظفر کو غصہ آگیا تھا۔

عطیہ نے قطعی پروا نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ اپنے شوہر کو کس طرح قابو کیا جاسکتا ہے اور کس طرح اس سے اپنی بات منوائی جاسکتی ہے۔

بالآخر اس نے ظفر کو قائل کرلیا تھا۔ ظفر کو یہ بات اچھی نہیں لگ رہی تھی لیکن بیوی کے مجبور کرنے پر وہ مان گیا تھا۔ وہ دونوں میاں، بیوی، نذر حسین اور فاطمہ کے پاس گئے۔ بات عطیہ نے کی۔ نذر حسین نے سنتے ہی انکار کردیا تھا۔

’’نہیں بہن! یہ ممکن نہیں ہے، آپ سے پیسے لے کر ہم بیٹے کی شادی نہیں کرسکتے۔‘‘

عطیہ نے پینترا بدلا۔ ’’اس کا مطلب ہے بھائی صاحب! آپ ہمیں ابھی تک غیر ہی سمجھتے ہیں۔‘‘

’’ایسی بات نہیں ہے۔‘‘ نذر حسین کا لہجہ اس بار کمزور سا تھا۔

’’ایسی ہی بات ہے اور پھر ہمیں اپنے بچوں کی خوشی کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔‘‘ عطیہ زور دے کر بولی اور ظفر کو کہنی ماری۔

’’ہمیں اپنی بچی اور آپ کے بچے، دونوں کی خوشی عزیز ہے۔‘‘ ظفر گڑبڑا کر بولا۔

’’ہاں یہ تو ہے۔‘‘ فاطمہ نے ان کی تائید کی۔

’’لیکن آپ سے رقم لے کر بیٹے کی شادی کریں، آخر سننے والے کیا کہیں گے۔‘‘

’’کسی کو کیا پتا چلے گا۔‘‘ عطیہ بولی۔ ’’اور پھر ہم آپ کو قرض کے طور پر دے رہے ہیں، جب آپ کی کمیٹی نکلے، دے دیجئے گا۔‘‘

’’ایسا ممکن ہے۔‘‘ فاطمہ نے شوہر کی طرف دیکھا۔ ’’میری بھی خواہش ہے کہ بیٹے کے سر پہ سہرا دیکھوں، اس کی خوشیاں دیکھوں، اس کے بچوں کو کھلاؤں۔‘‘

نذر حسین نے انکار میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بحث ہوتی رہی پھر نذر حسین بادل نخواستہ مان گیا تھا۔ ان میں طے ہوا کہ ظفر عباس انہیں شادی کی تیاریوں کے لئے ڈھائی لاکھ روپے دے گا اور وہ دو مہینے بعد کی تاریخ دیں گے، یہ تاریخ قرۃ العین کے سسرال والوں کی تاریخ کے ساتھ ہی دی جانی تھی۔ یہ بھی طے ہوا کہ تینوں خاندان باہم مل کر شادی کی تاریخ دیں گے اس کے بعد ہی ظفر انہیں شادی کے لئے یہ رقم دے گا۔

عطیہ بے حد خوش تھی۔ اس کی خواہش پوری ہو رہی تھی، اس نے فوراً شیما اور قرۃ العین کی شادی کی تیاریاں شروع کردی تھیں۔ پیسے کی کمی نہیں تھی اس لئے دل کھول کر خریداری کر رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی کمی نہ رہے۔

اس نے طارق روڈ سے کپڑوں کی خریداری کی، زیور زیب النساء اسٹریٹ سے خریدے، دونوں بیٹیوں کے لئے ایک سے جڑاؤ سیٹ اور عام سونے کے سیٹ لئے تھے، ان کی مجموعی مالیت چار لاکھ روپے سے بھی زیادہ تھی یعنی دونوں بیٹیوں کو دو دو لاکھ کا زیور دیا تھا۔ فرنیچر کلفٹن سے لیا تھا۔ اگرچہ عباس کے ماں، باپ نے فرنیچر کے لئے منع کیا تھا، ان کے پاس بالکل نیا فرنیچر تھا اور بھی دوسرا سامان موجود تھا۔

فاطمہ نے دبے لفظوں میں کہا کہ وہ بچی کو ان سب چیزوں کے بجائے کیش دے دیں تو زیادہ بہتر رہے گا مگر عطیہ نے کہا کہ یہ سب ضروری ہے، لڑکی سسرال میں اپنی چیز استعمال کرے تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر فاطمہ نے ایک لڑکی کے جہیز پر دس لاکھ سے زیادہ خرچ کئے تھے۔

شادی کے دن اس کا سر فخر سے اونچا ہو رہا تھا پھر ظفر عباس نے دونوں دامادوں کو سرپرائز دیا۔ اس نے انہیں کاروں کی چابیاں دی تھیں۔ قرۃ العین کے سسرال والے کھاتے پیتے لوگ تھے، ان کے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن نذر حسین اور فاطمہ کی خوشی دیکھنے والی تھی، جہیز اور پھر کار...... سب ان کی توقع سے بڑھ کر تھا۔

ظفر نے انہیں ڈھائی لاکھ روپے الگ دیئے تھے۔ بری بھی اچھی تھی لیکن عطیہ کو خاص پسند نہیں آئی اور نہ ہی زیور اچھا لگا۔ عباس کا ولیمہ ہوٹل میں ہوا تھا، محدود تعداد میں مہمان تھے، زیادہ تر ظفر اور عطیہ کے جاننے والے تھے، نذر حسین اور فاطمہ کے جاننے والے گنتے چنے ہی تھے۔

شادی کے ایک ہفتے بعد عباس اور شیما نے کار کے ذریعے پورے ملک کی سیر کا پروگرام بنایا۔ نذر حسین اور فاطمہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ شادی کے بعد ان کا رویہ شیما کے ساتھ اچھا تھا، وہ جب بھی گھر جاتی، ان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتی تھی۔

عباس اس سے دیوانہ وار محبت کرتا تھا۔ اس نے شیما کے عام سے حسن کو خاص بنا دیا تھا، وہ اتنی اچھی لگنے لگی تھی کہ اس کی سہیلیاں اور جاننے والیاں رشک کرنے لگی تھیں۔

شادی کے پندرھویں دن وہ سفر پر روانہ ہوئے۔ ان کا پروگرام تھا کہ سکھر میں ایک رات رک کر پھر اگلے روز لاہور پہنچیں گے، وہ دن لاہور میں قیام کرنے کے بعد وہ اسلام آباد جائیں گے، ایک دن وہاں رک کر پھر شمالی علاقہ جات کی طرف چلے جائیں گے، خوبصورت پہاڑی علاقوں میں دس بارہ دن گزار کر واپس کراچی آجائیں گے۔

وہ صبح آٹھ بجے کراچی سے نکلے۔ شیما اور عباس دونوں کے پاس موبائل تھے۔ انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ وہ انہیں میسج کرتے رہیں گے۔ دوپہر بارہ بجے تک کوئی پیغام نہیں آیا تھا، عطیہ بے قرار ہو کر نذر حسین کے گھر چلی آئی۔

’’ان لوگوں کی طرف سے کوئی پیغام آیا؟‘‘ اس نے پوچھا۔

’’نہیں بہن...... ابھی تک تو کوئی پیغام نہیں آیا، میں خود بھی فکرمند ہوں۔‘‘ فاطمہ نے کہا۔ نذر حسین اس وقت گھر پر نہیں تھا۔

’’میرا دل پریشان ہے۔‘‘ عطیہ بولی۔ ’’نجانے انہوں نے اب تک پیغام کیوں نہیں بھیجا۔‘‘

’’شاید خیال نہ آیا ہو۔‘‘ فاطمہ نے خیال ظاہر کیا۔ ’’نئے نئے شادی شدہ جوڑے ایک دوسرے کے سوا کم ہی کسی شے پر دھیان دیتے ہیں۔‘‘

’’ہاں بہن! یہ تو ہے۔‘‘ فاطمہ کی بات نے عطیہ کو کسی قدر مطمئن کردیا تھا۔ وہ کچھ دیر فاطمہ کے پاس بیٹھی رہی پھر اسے نذر حسین کا خیال آیا۔

’’بہن! نذر حسین کہاں ہیں؟‘‘

’’وہ اسٹاک ایکسچینج گئے ہیں۔‘‘ فاطمہ نے بتایا۔ ’’شاید دو تین بجے تک آجائیں۔‘‘

’’اچھا میں چلتی ہوں، جیسے ہی ان کی طرف سے کوئی خیر خبر آئے، مجھے ضرور بتایئے گا۔‘‘

’’اور آپ بھی......! میں بھی پریشان ہو رہی ہوں، یہ عباس اتنا غیر ذمہ دار تو نہیں ہے۔‘‘

عطیہ گھر آگئی۔ اس کا دل پھر گھبرانے لگا۔ اس نے ظفر کے دفتر فون کر کے اسے بتایا۔ اس نے بھی عطیہ کو تسلی دی۔ ’’ارے بھئی جوان بچے ہیں...... اپنی ترنگ میں ماں، باپ کو بھول گئے کہ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے، میرا خیال ہے کہ اب وہ سکھر پہنچ کر ہی فون کریں گے۔‘‘

’’اللہ کرے۔‘‘ عطیہ نے کہا تھا۔

دوپہر ڈھلی تھی، پھر شام ہوئی۔ یہ مارچ کی آخری تاریخیں تھیں، دن میں خاصی گرمی ہوجاتی تھی۔

عطیہ نے سوچا شاید وہ لوگ درمیان میں حیدرآباد میں رکے ہوں، وہاں پر بھی سیر و تفریح کے لحاظ سے کئی قابلِ دید جگہیں تھیں، اگر وہ رکے بغیر چلتے رہتے تو شام چھ سات بجے تک ضرور سکھر پہنچ جاتے۔

شام چھ بجے ظفر دفتر سے آگیا۔ اس کے ساتھ ہی نذر حسین اور فاطمہ بھی ان کے گھر آئے۔ انہوں نے آتے ہی پہلا سوال کیا۔ ’’بچوں کی طرف سے کوئی اطلاع آئی؟‘‘

’’ابھی تک تو نہیں آئی۔‘‘ عطیہ نے فکرمندی سے کہا۔ ’’پتا نہیں یہ بائی روڈ کیوں گئے، آرام سے بائی ایئر بھی جاسکتے تھے، گھنٹے بھر میں لاہور پہنچ جاتے۔‘‘

’’بھئی بچے ہیں...... انجوائے کرنا چاہتے ہیں...... اپنا ملک دیکھنا چاہتے ہیں۔‘‘ ظفر نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ’’جہاز سے نیچے سوائے زمین کے اور کیا نظر آتا۔‘‘

’’تب انہیں گھر والوں کا خیال تو رکھنا چاہئے تھا۔‘‘ عطیہ کو غصہ آنے لگا تھا۔ ’’آنے دیں، شیما کو میں بتاتی ہوں۔‘‘

’’اور میں بھی عباس کے کان کھینچوں گا۔‘‘

فاطمہ اور نذر حسین کچھ دیر بیٹھ کر اٹھ رہے تھے کہ نشست گاہ میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ فاطمہ نے عطیہ کی طرف دیکھا۔ اس نے جھپٹ کر فون اٹھایا۔ ’’ہیلو کون......! آپ کون ہیں...... کیا کہہ رہے ہو؟‘‘ عطیہ بولی۔ اس نے شوہر کی طرف دیکھا۔ ’’کوئی سندھی لہجے میں بول رہا ہے۔ کہتا ہے کسی مرد سے بات کراؤ۔‘‘

’’خدا خیر کرے۔‘‘ فاطمہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ظفر نے بیوی سے فون لیا۔

’’کون ہو تم......؟ کیا بات ہے...... ہاں ہاں...... ہاں...... بکواس مت کرو۔‘‘ اچانک اس نے چلا کر کہا اور پھر فون بند ہوگیا۔ ظفر نے فون رکھ دیا، اس کا چہرہ پسینے میں تر ہوگیا، باقی تینوں دھواں دھواں چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے پھر نذر حسین نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

’’کیا ہوا ظفر بھائی......! فون پر کون تھا...... اس نے کیا بتایا ہے؟‘‘

ظفر اپنی حالت پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ ’’اس نے کہا ہے کہ شیما اور عباس ان کے پاس ہیں، کل کوریئر کے ذریعے ایک پارسل ملے گا جس میں شیما کی انگوٹھی اور عباس کی ٹائی کی وہ پن ہوگی جو اس نے جاتے وقت لگا رکھی تھی اور ساتھ ہی ان کا مطالبہ ہوگا۔‘‘

یہ سنتے ہی عطیہ نے رونا شروع کردیا تھا۔ فاطمہ دوپٹہ منہ پر رکھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ نذر حسین نے پریشانی سے کہا۔ ’’ہوسکتا ہے کسی نے مذاق کیا ہو؟‘‘

’’ابھی پتا چل جاتا ہے۔‘‘ ظفر نے جھپٹ کر فون کی سی ایل آئی چیک کی اور پھر اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی تھی۔ ’’فون حیدرآباد کے کسی پی سی او سے کیا گیا ہے، ہم...... مجھے لگ رہا ہے شیما اور عباس کو ڈاکوؤں نے اغواء کرلیا ہے۔‘‘

یہ سنتے ہی عطیہ اور فاطمہ نے بلند آواز میں رونا شروع کردیا۔ دونوں مرد انہیں چپ کرانے کی کوشش کرنے لگے۔

’’چپ رہو۔‘‘ ظفر نے تنبیہی لہجے میں کہا۔ ’’یہ بات باہر نکلنی نہیں چاہئے، اس شخص نے دھمکی دی ہے اگر بات پولیس تک گئی تو ہم دونوں......!‘‘ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن مفہوم سب نے سمجھ لیا تھا۔

’’خدا نہ کرے۔‘‘ فاطمہ تڑپ کر بولی۔

’’ہمیں کل تک انتظار کرنا ہوگا۔‘‘ نذر حسین نے سوچتے ہوئے کہا۔ ’’کوریئر بھیجی جانے والی کوئی شے چوبیس گھنٹے سے پہلے نہیں ملتی ہے۔‘‘

’’خدا جانے ہمارے بچے کس حال میں ہوں گے۔‘‘ عطیہ پھر رونے لگی۔

’’رومت بہن......! خدا خیر کرے گا۔‘‘ نذر حسین نے اسے تسلی دی۔ ’’کم از کم اتنا تو سکون ہے کہ وہ دونوں زندہ ہیں۔‘‘

’’پولیس کو خبر کرتے ہیں۔‘‘ فاطمہ نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

’’ہرگز نہیں......!‘‘ ظفر اور نذر حسین بیک وقت بولے تھے۔ پھر ظفر نے کہا۔ ’’اس شخص نے واضح الفاظ میں دھمکی دی تھی، اس نے کہا تھا کہ بات پولیس تک گئی تو پھر ہم کوئی مطالبہ نہیں کریں گے پھر آپ کو اپنے بچوں کی لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔‘‘

’’خدا کے لئے ایسی بات مت کریں۔‘‘ عطیہ دہشت زدہ ہوگئی تھی۔ ’’کوئی ضرورت نہیں ہے پولیس کو بتانے کی، آپ ان کا ہر مطالبہ پورا کریں اور میری بیٹی کو واپس لائیں۔‘‘

عطیہ کی اس بات پر فاطمہ دلگرفتہ ہوگئی تھی۔ ’’بہن! صرف آپ کی بیٹی......! کیا میرا بیٹا نہیں آئے گا؟‘‘

’’معاف کرنا بے دھیانی میں منہ سے نکل گیا تھا۔‘‘ حالات کی نزاکت کے باوجود عطیہ نے فوراً معذرت کرلی۔ ’’خدا دونوں بچوں کو خیر سے گھر لائے۔‘‘

نذر حسین اور فاطمہ واپس گھر جانا چاہتے تھے لیکن ظفر اور عطیہ نے انہیں روک لیا۔ دونوں خاندانوں کی پریشانی مشترک تھی اور دونوں کو مل کر ہی عہدہ برآ ہونا تھا۔ عورتیں بیڈروم میں چلی گئیں اور ظفر اور نذر حسین نے نشست گاہ میں سونے کا فیصلہ کیا تھا لیکن نیند کسے آتی۔ ظفر نے کافی بنوائی تھی، اسے پیتے اور آپس میں بچوں کی باتیں کرتے رہے۔

اچانک بارہ بجے کے قریب نذر حسین کو یاد آیا۔ ’’میں نے اپنی دوا تو لی ہی نہیں ہے۔‘‘

نذر حسین نے انہیں یہ بتایا تھا کہ اس کے دل کا ایک والو رگ بلاک ہونے سے متاثر ہو رہا ہے، ڈاکٹر نے اسے دوائیں دی ہیں۔ ظفر نے پیشکش کی کہ وہ بھی ساتھ چلتا ہے لیکن نذر حسین نے منع کردیا۔ ’’یہاں کسی کا ہونا ضروری ہے، عین ممکن ہے کسی کا فون آجائے، یہ عورتیں ان حالات میں سوائے رونے دھونے کے اور کیا کریں گی۔‘‘

ظفر نے اس سے اتفاق کیا۔ نذر حسین اپنے گھر چلا گیا۔ دونوں گھر دو گلیوں کے فرق سے تھے۔ مین روڈ کی طرف جانے کے لئے ظفر اور اس کی گلی کے رہنے والوں کو نذر حسین کے مکان والی گلی سے گزرنا پڑتا تھا، اس کے مکان کے عقبی حصے میں کھیل کا وسیع میدان تھا گویا نذر حسین کا بنگلہ دونوں طرف سے کھلا تھا۔ ظفر عباس کا خیال تھا کہ وہ چند منٹ میں لوٹ آئے گا۔ فاصلہ ہی کتنا تھا لیکن نذر حسین کو جانے اور آنے میں کوئی گھنٹہ لگ گیا۔ وہ ایک بجے کے قریب واپس آیا تھا۔

ظفر عباس نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی سرخ رنگت اس وقت تمتما رہی تھی اور سانس ذرا تیز چل رہا تھا۔ اس نے آتے ہی ظفر عباس سے معذرت کی۔ ’’میں اب لیٹوں گا کیونکہ اس دوا کو کھا کر مجھے نیند آنے لگتی ہے۔‘‘

’’کوئی بات نہیں، آپ سو جائیں۔‘‘ ظفر نے کہا۔ نذر حسین قالین پر ہی تکیہ اور چادر لے کر لیٹ گیا اور چند منٹ میں اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔ ظفر کو تعجب ہوا کہ وہ اس حال میں بھی اتنی بے فکری سے سو سکتا ہے جبکہ اس کا اکلوتا بیٹا اور بہو ڈاکوؤں کے قبضے میں تھی۔

ظفر یہ سوچ کر اتنا دہشت زدہ ہوا کہ اس کی جوان اور خوبصورت بیٹی جرائم پیشہ لوگوں کے قبضے میں تھی اور وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کرنے کے لئے آزاد تھے۔ اس خیال سے وہ اتنا گھبرایا کہ باہر لان میں نکل آیا۔ یہاں شیما نے پرندے پالے ہوئے تھے، اس کی شادی کے روز یہ سارے پرندے آزاد کردیئے گئے تھے۔ خالی پنجرے دیکھ کر وہ اور اداس ہوگیا۔ خاصی دیر تک ٹہلنے کے بعد اسے ذرا سکون محسوس ہوا تو وہ اندر آکر لیٹ گیا تھا، رات بھر سوتا جاگتا رہا تھا۔

(جاری ہے)

صبح ان کے لئے بے حد اداس تھی۔ بمشکل تھوڑا بہت ناشتہ زہر مار کیا تھا۔ فاطمہ سے تو بالکل نہیں کھایا گیا تھا۔ اس نے بس آدھی پیالی چائے پی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔ ناشتے کے بعد نذر حسین نے جو ساری رات آرام سے سوتا رہا تھا، ظفر مہدی سے کہا۔ ''جیسے ہی کوئی اطلاع ملے، مجھے ضرور بتایئے گا۔''

''ظاہر ہے۔'' ظفر پھیکے انداز میں بولا۔ ''آپ کو نہیں تو پھر کسے



بتاؤں گا۔''

ان کے جانے کے بعد عطیہ آنسو بہانے لگی تھی۔ ظفر اسے تسلی دینے لگا۔ عطیہ کے ذہن میں ایک ہی خدشہ تھا۔ وہ بولی۔ ''اگر انہوں نے شیما کی آبرو......!''

''خدا نہ کرے۔'' ظفر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ ڈاکو بے اصول نہیں ہوتے، جب تک ان کا مطالبہ پورا کرنے سے انکار نہ کیا جائے، یہ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے ہیں، اللہ پر بھروسہ رکھو، ہم بحفاظت اپنی بیٹی اور داماد کو چھڑا لائیں گے۔''

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ ظفر دفتر نہیں گیا تھا، اس نے اپنے منیجر کو فون کر کے آج کے کام دیکھنے کو کہا تھا اور خود طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا۔

بارہ بجے بنگلے کی کال بیل بجی۔ مستقل کام کرنے والی ملازمہ نے آکر بتایا کہ باہر ڈاک والا آیا ہے، وہ کوریئر کمپنی کا نمائندہ تھا، اس نے ظفر مہدی کے نام آیا پارسل اس کے حوالے کیا۔

اندر آکر ظفر نے پارسل کھولا۔ اندر سے ڈبہ برآمد ہوا۔ ظفر نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈبہ کھولا۔ عطیہ اس کے ساتھ تھی۔ اندر رکھی انگوٹھی اور ٹائی پن دیکھ کر انہیں سکتہ سا ہو گیا تھا۔

وہ ان چیزوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ انگوٹھی اور ٹائی پن انہوں نے ہی بیٹی اور داماد کو تحفے میں دی تھی۔ عطیہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انہیں ایک امید تھی کہ شاید یہ کوئی مذاق ہو، ان کے بیٹی داماد خیریت سے ہوں لیکن اب یہ آس بھی ٹوٹ گئی تھی۔ ظفر نے ڈبے کے اندر رکھا کاغذ نکالا۔ کسی نے بال پوائنٹ سے ٹیڑھی میڑھی لائنوں میں لکھا تھا۔

''تمہارا داماد اور بیٹی ہمارے پاس ہیں، ابھی تک ان کو پورے آرام سے رکھا ہے، خراش بھی لگنے نہیں دی ہے، آپ تیس لاکھ روپے تیار کرو، دو دن بعد بتایا جائے گا پیسے کہاں دینے ہیں، پولیس کو اطلاع کی یا ایک روپیہ بھی کم دیا تو تمہارے بچوں کی لاشیں سپر ہائی وے پر مل جائیں گی۔''

نیچے کسی کا نام نہیں تھا۔ ظفر مہدی متفکر نظر آنے لگا تھا۔ وہ بے شک دولت مند آدمی تھا لیکن فوری طور پر تیس لاکھ کا انتظام کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا سرمایہ فیکٹری میں لگا ہوا تھا، بچیوں کی شادی کے لئے اس نے جو رقم رکھی تھی، وہ ساری کی ساری خرچ ہو چکی تھی، اپنی طرف سے کوشش کر کے وہ دس لاکھ کر سکتا تھا، اس سے زیادہ کے لئے اسے قرض لینا پڑتا۔

عطیہ جو رقعہ پڑھ چکی تھی، اس نے روتے ہوئے ظفر سے کہا۔ ''میں نہیں جانتی، آپ میرا زیور بیچیں یا فیکٹری...... تیس لاکھ دے کر میری بچی کو لے آئیں۔''

''تم فکر نہ کرو، میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔'' ظفر نے کہا پھر فون پر نذر حسین کا نمبر ملایا اور کہا۔ ''نذر بھائی! آپ آجائیں، کوریئر سے پارسل مل گیا ہے۔''

وہ فوراً بولا۔ ''میں آ رہا ہوں۔''

ذرا دیر میں نذر حسین اور فاطمہ ان کے گھر آ گئے۔ ظفر نے ساری صورتحال اور رقعہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ ''نذر بھائی! میں دس لاکھ تک کر سکتا ہوں اور اتنا ہی قرض لے سکتا ہوں، دو دن میں نہ یہ گھر بک سکتا ہے اور نہ فیکٹری...... بیس لاکھ ہو سکتے ہیں لیکن مطالبہ تیس لاکھ کا ہے، آپ بتائیں کیا کر سکتے ہیں؟''

نذر حسین نے کہا۔ ''یہی معاملہ میرے مکان کا بھی ہے، دو دن میں اس کا گاہک ملنا محال ہے، میرے شیئرز میں کوئی تین لاکھ روپے ہیں، وہ میں کل لا سکتا ہوں اس کے علاوہ فاطمہ اور ریشماں کا زیور ہے، اس کے بھی دو لاکھ تک مل سکتے ہیں یعنی پانچ لاکھ ہو سکتے ہیں، میری کسی سے جان پہچان بھی نہیں ہے جو پانچ لاکھ قرض دے دے۔''

''تین لاکھ کا میرا زیور ہے۔'' عطیہ جلدی سے بولی۔

''باقی دو لاکھ میں کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' نذر حسین نے کہا۔ ''ہمارے پاس وقت نہیں ہے اور یہ لوگ بہت چالاک لگتے ہیں، فون نہیں کیا کہ براہ راست بات چیت کے ذریعے بارگیننگ کی جا سکتی ہے اس لئے انہوں نے خط لکھا، اب ہمیں پورے تیس لاکھ روپے جمع کرنے ہی پڑیں گے۔''

''درست کہا۔'' ظفر نے تائید کی۔ ''نذر بھائی! ہمیں ابھی سے کوشش کرنی ہے، وقت کم ہے، ایسا نہ ہو کہ تاخیر سے کوئی بڑا نقصان ہو جائے۔''

''اللہ نہ کرے۔'' فاطمہ نے دہل کر کہا تھا۔ ''منہ سے اچھی بات نکالیں بھائی!''

نذر حسین اور فاطمہ رخصت ہو گئے۔ ظفر نے سب سے پہلے اپنے بینک اکاؤنٹس چیک کئے۔ اس کے اکاؤنٹس میں مجموعی طور پر سات لاکھ نوے ہزار روپے کی رقم تھی، ڈیڑھ لاکھ کے شیئرز سرٹیفکیٹس تھے اور اتنی ہی مالیت کے پرائز بونڈز تھے۔ عطیہ کے پاس تقریباً ساڑھے تین لاکھ روپے کا زیور تھا۔ فوری طور پر بیچنے پر اس کے تین لاکھ مل سکتے تھے یعنی اب اسے سات لاکھ روپے اور کرنے تھے۔ اس نے سوچا کہ گھر گروی رکھ کر سات لاکھ روپے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑتا رہتا تھا۔ وہ گھر سے نکل گیا۔

رات گئے وہ واپس آیا تو کسی قدر مطمئن تھا۔ اس نے احتیاطاً دس لاکھ روپے کا انتظام مزید کر لیا تھا۔ ممکن تھا نذر حسین اتنی رقم کا بندوبست نہ کر پائے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت نذر حسین ان کے پاس آیا۔ ''میں نے چھ لاکھ کر لئے ہیں۔'' وہ بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ''ضرورت کے سوا مکان کا سارا سامان بھی بیچ دیا ہے، ایک قرض دینے والے سے بات کی ہے، وہ مکان پر قرض دینے کے لئے تیار ہے، آپ بتائیں ظفر صاحب کہ آپ کے پاس کتنی رقم اکٹھا ہوئی ہے، باقی میں اس سے قرض لے لوں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے نذر بھائی!'' ظفر نے کہا۔ ''میں نے انتظام کر لیا ہے۔''

نذر حسین نے ساتھ لائے ہوئے بیگ سے رقم نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ ''کاش وہ لوگ فون کریں تو ہم کچھ بارگیننگ کر سکیں۔''

''نہیں...... ان سے بحث مت کرنا۔'' عطیہ نے جلدی سے کہا۔ مسلسل رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ''بس کسی طرح ان دونوں کو لے آؤ۔''

''تم فکر نہ کرو۔'' ظفر نے نرمی سے کہا۔ ''ہم اپنے بچوں کی سلامتی کو اولین ترجیح دیں گے۔''

''میرا خیال ہے وہ لوگ کل رابطہ کریں گے۔'' نذر حسین نے کہا۔

''آج رات بھی ممکن ہے۔'' عطیہ بولی۔ ''بس جلدی سے میری بچی آجائے اور عباس بھی۔''

نذر حسین کچھ دیر ان کے پاس بیٹھا پھر چلا گیا۔ ظفر اور عطیہ اس کے خلوص سے متاثر تھے۔ اس نے اپنی ساری جمع پونجی ان کو دے دی تھی اور اب اس کے پاس سوائے مکان کے کچھ نہیں رہا تھا، وہ اسے بھی گروی رکھنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔

ظفر نے رات تک چوبیس لاکھ کا انتظام کر لیا تھا۔ اب ان کے پاس تیس لاکھ کی رقم تھی۔ رات گئے تک وہ اغواء کرنے والوں کی جانب سے کسی پیغام کا انتظار کرتے رہے تھے پھر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

رات کسی وقت دروازے کی کال بیل بجی۔ ظفر کچی نیند سے اٹھ کر باہر آیا۔ اس نے دروازے پر پہنچ کر پوچھا۔ ''کون ہے؟'' لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ سوراخ سے باہر جھانکنے پر کوئی نظر نہیں آیا تھا۔

وہ ذرا پیچھے ہٹا تو اس کی نظر فرش پر پڑے سفید لفافے پر پڑی۔ اس نے لفافہ اٹھایا۔ اسے یاد آیا کہ رات جب وہ ایک بار ادھر آیا تھا تو یہاں کوئی لفافہ نہیں تھا گویا یہ لفافہ ابھی ابھی کسی نے پھینکا ہے اور کال بیل بجا کر چلا گیا تھا۔ وہ لفافہ لے کر اندر آیا، عطیہ بھی اٹھ گئی تھی۔ ''باہر کون تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی نہیں...... میں گیا تو یہ لفافہ باہر پڑا تھا۔'' اس نے لفافہ کھولتے ہوئے کہا۔ اندر ایک رقعہ تھا۔ اس پر اسی انداز میں بچگانہ سی لکھائی میں تحریر تھا۔

''تمہارا کوئی بندہ رقم لے کر فجر کی نماز کے بعد جامعہ ملیہ روڈ پر پہنچے اور پیدل شارع فیصل کی طرف جائے، ہمارا آدمی راستے میں یہ رقم لے لے گا اور وہ نشانی کے طور پر تمہاری بیٹی کا پرس اسے دکھائے گا، تمہارا بندہ رقم دے کر چپ چاپ واپس چلا جائے، اگر کسی نے رقم لینے والے کا تعاقب کرنے کی کوشش کی تو...... آگے آپ خود سمجھدار ہو...... بس اتنا یاد رکھنا آپ سب پوری طرح ہماری نظر میں ہو، یہ رقعہ تمہارے گھر تک ہمارے آدمی نے پہنچایا ہے۔''

''یہ لوگ ہمارے گھر تک چلے آئے۔'' عطیہ نے ڈرے ہوئے انداز میں کہا۔

ظفر نے سر ہلایا۔ ''مجھے لگ رہا ہے یہ کوئی عام ڈاکو نہیں ہیں بلکہ انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بنا کر عباس اور شیما کو اغواء کیا ہے، اندرون سندھ سے کراچی تک ان کے بندے موجود ہیں، اچھا ہوا ہم میں سے کسی نے پولیس کو اطلاع نہیں دی۔''

''اللہ کا شکر ہے، بس آپ جا کر یہ رقم ان کے آدمی کو دے آئیں تاکہ وہ ہماری بچی کو رہا کر دیں۔''

ظفر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں جا سکتا۔''

''کیوں......؟'' عطیہ کے انداز میں حیرانی تھی۔

''اس رقعے کو غور سے پڑھو، اغواء کرنے والوں نے کہا ہے کہ رقم میرا کوئی آدمی لے کر آئے، میں نہیں۔''

''پھر کون جائے گا؟''

''میں نذر بھائی سے بات کرتا ہوں۔'' ظفر بولا۔ اس نے فون اٹھایا۔ نذر حسین شاید سو گیا تھا۔ کوئی چوتھی بیل پر اس نے فون اٹھایا مگر اس کی آواز میں نیند کا خمار بالکل نہیں تھا لیکن سانس تیز چل رہا تھا۔ اس نے معذرت کی۔

''معاف کرنا ظفر بھائی! میرا دل گھبرا رہا تھا اس لئے باہر لان میں ٹہل رہا تھا، کیا ان کی طرف سے کوئی پیغام آیا ہے؟''

''ہاں! آپ فوراً چلے آئیں۔'' ظفر نے جواب دیا۔

نذر حسین چند منٹ میں ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ظفر نے اسے رقعہ دکھایا۔ ''اب ہمیں فجر کے بعد یہ رقم ان تک پہنچانی ہے۔''

''رقم آپ لے کر جائیں گے؟'' نذر حسین نے سوالیہ نظروں سے ظفر کی طرف دیکھا۔

''نہیں! بلکہ آپ کو لے جانی ہے، رقعے میں رقم میرے بجائے کسی اور آدمی کے توسط سے پہنچانے کا حکم ہے ورنہ میں خود لے جاتا۔''

''آپ فکر نہ کریں، میں یہ کام کر لوں گا۔'' نذر حسین نے کسی قدر بے تابی سے کہا۔ ''میں شیما بیٹی کا ہینڈ بیگ پہچانتا ہوں، فاطمہ میرے ساتھ جا کر اسے لائی تھی شاید وہ آج ہی ہمارے بچوں کو رہا کر دیں۔''

''اللہ کرے۔'' عطیہ نے بے ساختہ کہا تھا۔

''فجر میں تھوڑا وقت ہے۔'' نذر حسین نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''آپ ایسا کریں رقم کپڑے کے کسی تھیلے میں ڈال کر دے دیں۔''

عطیہ نے اسے کپڑے کے بجائے ایک فینسی قسم کا مضبوط تھیلا لا دیا۔ انہوں نے کاغذ میں لپٹی رقم اس میں ڈالی پھر عطیہ ان کے لئے کافی بنا لائی۔ جب تک انہوں نے کافی ختم کی، فجر کی اذان ہونے لگی۔ نذر حسین نماز پڑھنے کے لئے چلا گیا۔ اس نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ ''ظفر بھائی! آپ تھیلا لے کر دروازے کے پاس رہئے گا، میں نماز پڑھ کر لیتا ہوا نکل جاؤں گا، کہیں تاخیر کی وجہ سے ان کا بندہ مایوس ہو کر چلا نہ جائے۔''

''میں دروازے کے پاس رہوں گا۔'' ظفر نے اسے یقین دلایا۔

''بلکہ آپ مسجد کے باہر ہی تھیلا نذر بھائی کو دے دیں۔'' عطیہ نے جلدی سے کہا۔

''نہیں! آپ باہر مت جایئے گا، اگر ان کا کوئی بندہ نگرانی کر رہا ہے تو وہ نہ جانے کیا سمجھے۔'' نذر حسین نے مشورہ دیا۔

''ہاں! آپ باہر مت جایئے گا، وہ لوگ غصے میں آ گئے تو کہیں شیما اور عباس کو رہا کرنے سے ہی انکار نہ کر دیں۔'' عطیہ بولی۔

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تاوان کی رقم بڑھا دیں۔'' نذر حسین نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اس لئے میرا مشورہ ہے جب تک ہمارے بچے واپس نہیں آجاتے، کوئی ایسی حرکت نہ کریں۔''

نذر حسین نماز پڑھنے چلا گیا اور ظفر تھیلا لے کر مین گیٹ کے سامنے ہی ٹہلنے لگا تھا۔ عطیہ کو اس نے اصرار کر کے اندر بھیج دیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد نذر حسین کی واپسی ہوئی۔ اس وقت تک ہلکی سی روشنی نمودار ہو چکی تھی۔

نذر حسین اس سے تھیلا لے کر فوری طور پر روانہ ہو گیا تھا۔ یہ آخری موقع تھا جب ظفر نے اسے دیکھا۔

وہ اپنے گیٹ کے سامنے ٹہلتا رہا اور نذر حسین کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ روشنی نمودار ہوئی پھر سورج طلوع ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ نذر حسین زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں لوٹ آئے گا۔ ان کا علاقہ شارع فیصل سے زیادہ دور نہیں تھا اور رقعے سے اندازہ ہوتا تھا کہ رقم شارع فیصل سے پہلے کہیں لے لی جائے گی۔

اب تو نذر حسین کو گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران عطیہ کئی بار آکر اس سے پوچھ چکی تھی کہ نذر حسین آیا یا نہیں...... وہ جھنجھلا کر اسے بتاتا کہ اب تک نہیں آیا ہے۔ آخر اس نے خود جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید نذر حسین رقم دے کر اپنے گھر چلا گیا ہو۔ عطیہ بھی اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ بے چینی اور بے تابی سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ وہ دونوں چل پڑے۔

''مجھے ڈر ہے کہ ڈاکو کہیں نذر حسین کو بھی ساتھ نہ لے گئے ہوں۔'' راستے میں ظفر مہدی نے خدشہ ظاہر کیا۔

''لیکن انہیں کیوں لے جائیں گے؟'' عطیہ بولی۔

''کیا کہہ سکتے ہیں، ہو سکتا ہے ڈاکوؤں کو خطرہ ہو کہ ہم نے پولیس کو نہ بتا دیا ہو اور وہ اسے یرغمال بنا کر لے گئے ہوں کہ پولیس ہو بھی تو ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔''

اس دوران وہ نذر حسین کے مکان کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ یہ دیکھ کر ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے کہ مین گیٹ تھوڑا سا کھلا تھا۔ ظفر نے اسے دھکا دیا۔ وہ اندر آئے پھر کچھ سوچ کر ظفر نے واپس آکر کال بیل بجائی۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا، اس نے دوبارہ کال بیل بجائی، اس بار بھی کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ عطیہ اور ظفر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عطیہ بولی۔ ''یہاں کوئی نہیں ہے۔''

''نذر حسین نہ سہی فاطمہ کو تو ہونا چاہئے۔'' ظفر بولا۔ ''اندر چل کر دیکھو۔''

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' عطیہ نے اس کا بازو تھام لیا تھا۔ وہ دونوں ڈرے، سہمے اندر آ گئے۔ پہلا کمرہ جو کبھی بہترین فرنیچر سے سجی نشست گاہ تھی، اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ ظفر نے پہلے نذر حسین اور پھر فاطمہ کو آوازیں دیں مگر اس کی آواز خالی کمرے میں گونجتی رہی، پھر انہوں نے قدم آگے بڑھائے۔ ڈائننگ ہال میں دیکھا، وہ بھی خالی تھا، نذر حسین اور فاطمہ کا کمرہ بھی تقریباً خالی تھا۔ اچانک انہیں شیما اور عباس کے بیڈ روم سے ہلکی سی آہٹ کی آواز آئی۔

''وہاں کوئی ہے۔'' عطیہ نے سہم کر کہا۔ ظفر نے آگے بڑھ کر دروازہ دھکیلا اور پھر جو منظر سامنے آیا، اس کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس کی لاڈلی بیٹی شیما اس حال میں بیڈ سے بندھی تھی کہ اس کے جسم پر لباس کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔ ظفر عباس نے آنکھیں بند کر لیں تھیں اور عطیہ تڑپ کر اور چیخ مار کر بیٹی کی طرف لپکی تھی، اس نے اپنی چادر اس کے جسم پر ڈال دی اور بے تابی سے اسے آوازیں دینے لگی۔ شیما نیم غشی کی کیفیت میں کراہ رہی تھی اور سر تکیے پر پٹخ رہی تھی۔

عطیہ نے ظفر سے کہا۔ ''خدا کے لئے کسی ڈاکٹر کو بلائیں۔''

اس وقت تک ظفر جان چکا تھا کہ ان کے ساتھ درحقیقت کیا ہوا ہے۔ اس نے بیوی کی التجا نظر انداز کی۔ پہلے شیما کی نبض دیکھی۔ ظاہری حالت سے قطع نظر اس کی نبض تقریباً نارمل تھی پھر اس نے بے تحاشا روتی عطیہ کو جھنجھوڑا۔ ''ہوش میں آؤ، جو ہونا تھا، ہو چکا ہے، میں گھر سے کار لے کر آتا ہوں، تم شیما کو تلاش کر کے کچھ پہناؤ، اسے گھر لے جا کر ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔''

کئی بار سمجھانے پر بات عطیہ کی سمجھ میں آئی۔ وہ تیزی سے گھر کی طرف گیا، اس نے کار نکالی، نذر حسین کے مکان کے سامنے اس نے ایک بار ہارن دیا، عطیہ نے گیٹ کھولا، وہ کار اندر لے گیا، عطیہ نے گیٹ بند کر دیا۔

پھر انہوں نے مل کر شیما کو کار کی عقبی نشست پر لٹایا۔ اندر کوئی کپڑا نہیں ملا تھا اس لئے مجبوراً شیما کو عطیہ کی چادر میں ہی لپیٹنا پڑا تھا۔ ان کے گھر کام کرنے والی ملازمہ ابھی تک نہیں آئی تھی اس لئے وہ رازداری سے شیما کو اندر لے گئے پھر ظفر نے اپنے ایک بچپن کے دوست ڈاکٹر عمران کو فون کیا۔ اسے ایمرجنسی میں آنے کو کہا۔ اسی دوران عطیہ، شیما کو لباس پہنا چکی تھی۔ وہ بار بار ظفر سے پوچھتی تھی۔ ''میری بچی کو کیا ہوا ہے، اس کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے؟''

ظفر جانتا تھا ان کی بیٹی کے ساتھ یہ سلوک اس کے نام نہاد سسرال والوں نے کیا ہے۔ وہ کتنے بڑے دھوکے باز تھے، انہوں نے باقاعدہ پلان بنا کر یہ کام کیا اور ان سے نہ صرف لاکھوں روپے لے گئے بلکہ ان کی بیٹی کی زندگی بھی برباد کر گئے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک چیز نہیں چھوڑی تھی، گھر سے سارا سامان لے گئے تھے اور یہ کام اتنی صفائی سے کیا تھا کہ محلے والوں کو بھی خبر نہ ہو سکی تھی۔

ڈاکٹر عمران نے شیما کا معائنہ کیا۔ اس کے جسم پر لگے زخم صاف کر کے مرہم پٹی کی۔ اس دوران شیما مسلسل غنودگی کی کیفیت میں مزاحمت کرتی رہی۔ اس کے منہ سے التجائی آوازیں نکلتی رہی تھیں۔

پھر ڈاکٹر عمران نے اسے دو انجکشن دیئے، ایک طاقت کا اور ایک سکون کا...... تب فوراً ہی شیما سو گئی تھی۔ باہر ظفر بے تابی سے ٹہل رہا تھا۔ ڈاکٹر عمران کے باہر آتے ہی وہ اس کی طرف لپکا۔ ''یار! کیا ہوا ہے میری بچی کے ساتھ......؟''

ڈاکٹر عمران دکھی نظر آ رہا تھا۔ شیما اس کے ہاتھوں میں کھیلی تھی اور اب وہ اس حال میں تھی کہ اس کو دیکھتے ہوئے بھی شرم آ رہی تھی۔ اس نے اپنے دوست کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''میرے یار......! اسے کسی اسپتال میں دکھانے اور اس کی میڈیکل رپورٹ بنوانے کی فوری ضرورت ہے، پہلے یہ بتاؤ کہ یہ سارا چکر کیا ہے؟''

''ہم لٹ گئے...... برباد ہو گئے۔'' ظفر یکدم بکھر گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا پھر اس نے ڈاکٹر عمران کو خود پر گزرنے والی تفصیل سنائی۔ وہ تاسف سے سر ہلاتا رہا۔

''میرے خدا! اتنا بڑا دھوکا...... یہ لوگ پیشہ ور دھوکے باز لگتے ہیں۔''

''اب بتاؤ میں کیا کروں؟'' ظفر نے بے بسی سے کہا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ شور مچاؤں گا تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہوں گا۔''

''یہ تم سب مجھ پر چھوڑ دو۔'' ڈاکٹر عمران نے اعتماد سے کہا۔ ''شیما بیٹی کو لے کر میرے ساتھ چلو، پہلے اس کا میڈیکل چیک اپ کرانا لازمی ہے۔''

ڈاکٹر عمران اپنی کار میں شیما کو لے گیا تھا۔ اس نے اپنے کلینک میں لیڈی ڈاکٹر سے معائنہ کروا کے رپورٹ بنوائی۔ اس رپورٹ سے یہ اندوہناک بات سامنے آئی کہ شیما کے ساتھ چوبیس گھنٹے میں متعدد بار زیادتی کی گئی، اسے باندھ کر رکھا گیا تھا، اسے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور کھانے پینے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ یہ سن کر ظفر غم و غصے سے اپنے بال نوچنے لگا تھا۔ ”میں نے اپنی پھول سی بچی کن درندوں کے حوالے کردی تھی۔“

ڈاکٹر عمران اسے تسلی دیتا رہا تھا پھر اس نے اپنے واقف کار ایک اعلیٰ فوجی افسر سے رابطہ کر کے اس معاملے میں مدد مانگی۔ ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ معاملہ ایک عزت دار گھرانے کی آبرو کا ہے، پولیس نے عام طریقے سے تفتیش کی تو ان کی بہت بدنامی ہوگی۔ اس فوجی افسر کے کہنے پر سے مقامی تھانے میں ان دھوکے بازوں کے خلاف رپورٹ درج کر دی گئی۔ ان پر دھوکے بازی اور شیما کے ساتھ زیادتی کا الزام تھا۔ ظفر کے پاس نذر حسین اور عباس کے بارے میں جو معلومات تھیں، وہ انہوں نے پولیس کو فراہم کر دی تھیں۔ عطیہ کے پاس شادی کی البم میں ان کی تصویریں بھی تھیں۔

پولیس نے جب تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ عباس کسی سرکاری ادارے میں ملازم نہیں تھا۔ بے شک وہاں اس نام کا ایک اور شخص تھا لیکن وہ عباس نہیں تھا۔ اسی طرح نذر حسین کی اسٹاک مارکیٹ میں کام کرنے والی بات بھی غلط تھی، وہ کبھی وہاں نہیں گیا اور نہ ہی اس نے کوئی شیئرز خریدے یا بیچے تھے۔ انہوں نے جو باتیں کی تھیں، سب جھوٹ نکلی تھیں۔ گاڑی کے رجسٹریشن نمبر کے بارے میں معلوم کرایا جو ظفر عباس نے داماد کو گفٹ کی تھی، یہ کار اس سے اگلے روز ایک شخص عبدالغفار کے ہاتھ فروخت کر دی گئی جس روز عباس اور شیما ہنی مون پر روانہ ہوئے تھے۔

صحیح کہانی شیما نے پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد سنائی تھی۔ وہ اور عباس بے شک سفر پر روانہ ہوئے تھے لیکن ابھی وہ ایئرپورٹ کے پاس پہنچے تھے کہ عباس کو یاد آیا وہ اپنا پرس گھر بھول آیا ہے، اس میں اس کی ساری چیزیں تھیں۔ مجبوراً گاڑی واپس موڑی۔ راستے میں عباس نے شیما کو چاکلیٹ کھانے کو دی۔ اسے چاکلیٹ بے حد پسند تھی۔

جب وہ گھر کے پاس پہنچے تو اس کا ذہن چکرانے لگا تھا۔ مکان کے اندر داخل ہوتے ہی شیما ہوش و حواس سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ اسے وقفے وقفے سے ہوش آتا تھا۔ ایک بار ہوش میں آئی تو اس نے نذر حسین کو اپنے پاس دیکھا تو وہ مارے صدمے کے بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اسے پھر اسپتال میں ہی ہوش آیا تھا۔ کتنے دن تک اسے اپنی اس بربادی کا یقین نہیں آیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو، ابھی جاگ جائے گی اور سب پہلے جیسا ہو جائے گا مگر رفتہ رفتہ اسے یقین آنے لگا کہ اس کے ساتھ جو ہوا ہے، وہ خواب نہیں حقیقت ہے، ایک بھیانک حقیقت......!

اوپر سے دباؤ پڑا تو پولیس نے سرگرمی سے تفتیش کی تھی مگر فریب دینے والے اتنے ہوشیار تھے کہ اپنے پیچھے ایک نشان بھی چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔ ہر راہ بند گلی میں ختم ہو رہی تھی۔ نذر حسین جس مکان کے بارے میں کہتا تھا کہ اس کا ہے، وہ کرائے کا نکلا تھا۔ اس کا ایک مہینے کا کرایہ نہیں دیا گیا تھا اور نہ ہی یوٹیلیٹی بلز ادا کیے گئے۔ مالک مکان بیرون ملک تھا اور اسے ایک ایجنٹ کی معرفت کرائے پر دیا گیا تھا۔ پولیس نے اسے بھی شامل تفتیش کیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان فریبیوں کے بارے میں کچھ پتا نہیں چل سکا کہ وہ کہاں سے آئے اور کہاں غائب ہو گئے۔

پولیس نے ان کی تصاویر کی مدد سے انہیں تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ظفر نے بدنامی کے خوف سے انہیں تصویر اخبارات میں شائع کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اپنے رشتے داروں اور جاننے والوں کو اس نے یہی بتایا تھا کہ لڑکے والے دھوکے باز نکلے تھے، سب کچھ سمیٹ کر فرار ہو گئے تھے۔ انہوں نے شیما پر گزرنے والے سانحہ کو چھپا لیا تھا۔ ظفر نے بمشکل وہ قرض ادا کیا تھا جو اس نے مکان گروی رکھ کر لیا تھا۔ اس کی فیکٹری کا کام بھی متاثر ہوا تھا، اسے پوری طرح بحال کرنے کے لئے اسے بینک سے قرض لینا پڑا تھا، اسے مجموعی طور پر پچاس لاکھ کا نقصان ہوا تھا لیکن اسے اور عطیہ کو اصل دکھ شیما کا تھا، اس سانحے کے بعد وہ بالکل بجھ کر رہ گئی تھی۔ ظفر نے ان لوگوں کی گرفتاری کے لئے کافی کوششیں کی تھیں لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ کیس داخل دفتر کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

محمود علی نے فائل بند کی اور انگڑائی لی۔ رات کا درمیانی پہر گزر رہا تھا، اسے شدت سے چائے کی طلب ہو رہی تھی، گھر والے سب سو چکے تھے۔ وہ خاموشی سے کچن میں آیا اور چائے بنانے لگا۔ اس دوران اس کا ذہن اس کیس میں الجھا ہوا تھا، وہ غور کر رہا تھا انسپکٹر سبحان ربانی نے ان دو کیسوں پر خاصی عرق ریزی سے کام کیا تھا، اس نے معلومات جمع کرنے میں خاصی محنت کی تھی لیکن تربیت اور ذہانت میں کمی کی وجہ سے وہ کئی اہم پہلو نظر انداز کر گیا تھا۔

سدرہ والے کیس میں مجرموں نے سامان منتقل کیا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ اس مقصد کے لئے گاڑی کہیں دور سے لائے ہوں۔ محمود نے سوچا اگر وہ مجرم ہوتا تو سامان جلد از جلد لے جانے کے لئے ٹرک استعمال کرتا۔ مجرموں نے لازماً کسی ٹرک والے سے معاملہ طے کیا ہوگا۔ ایف بی ایریا کے ان فلیٹوں کے نزدیک اور سہراب گوٹھ سے متصل علاقے میں بے شمار ٹرک اسٹینڈ تھے جہاں سے کرائے پر ٹرک چوبیس گھنٹے دستیاب رہتے تھے، انسپکٹر سبحان ربانی نے ان ٹرک اڈوں کو کھنگالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسا غالباً اس خیال سے نہیں کیا گیا تھا کہ ہزاروں ٹرکوں میں وہ ٹرک تلاش کرنا جس کے ذریعے مجرمان نے سامان منتقل کیا تھا، ایسا ہی تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کرنا۔ اگر انسپکٹر سبحان ربانی یہ کام کر گزرتا تو عین ممکن تھا شیما اس سانحے سے دوچار نہ ہوتی۔

ظفر اور عطیہ نے پولیس کو نذر حسین کے اس مکان میں آنے والے فرنیچر کا جو ڈیزائن بتایا تھا، وہ ہو بہو اس فرنیچر اور ساز و سامان سے ملتا تھا جو سدرہ کو جہیز میں دیا گیا تھا۔ گویا مجرمان ایف بی ایریا سے سیدھے جامعہ ملیہ روڈ کے اس بنگلے میں آکر آباد ہوئے تھے اور یہاں سے وہ ایک بار پھر سامان سمیت نکلے تھے۔ اس بار بھی انسپکٹر سبحان ربانی نے غلطی کی تھی، اس نے پھر اس ذریعے کو نظر انداز کیا جس کی مدد سے مجرمان سامان نکال کر لے گئے تھے۔

اس بنگلے کا پورچ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سامان لے جانے والا ٹرک آسانی سے آسکتا تھا۔ اگر سبحان ربانی تفتیش میں اس پہلو کو مدنظر رکھتا تو عین ممکن تھا ان مجرموں کے نئے ٹھکانے کا پتا چل جاتا۔

چائے بنا کر وہ اوپر آیا۔ اس نے فائل لی اور جہاں جہاں تفتیش کے کمزور پہلو تھے، پنسل سے ان کی نشاندہی کرنے لگا۔ یہ کام کرنے کے دوران اس نے چائے پی اور سکون سے سو گیا۔ صبح اسے ذرا دیر سے دفتر جانا تھا اس لئے وہ دیر تک سوتا رہا۔ دس بجے اٹھ کر وہ نیچے آیا، امی نے ناشتہ بنا لیا تھا، اس نے ناشتہ کیا، اوپر جا کر تیار ہوا اور دفتر کے لئے نکل گیا۔

فائل اس نے ساتھ لے لی تھی۔ اگرچہ ڈی ایس پی کی حیثیت سے وہ داخل دفتر کیس کی آزادانہ تفتیش کے لئے کسی کو جواب دہ نہیں تھا لیکن اس نے بہتر سمجھا کہ اس کیس کے لئے ایس پی سے باقاعدہ اجازت طلب کرے۔ ایس پی اصغر حیات کا شمار ہیڈ کوارٹر کے معقول افسروں میں ہوتا تھا۔ محمود علی سیدھا ان کے دفتر پہنچا، سیلوٹ کر کے وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا اور فائل ایس پی اصغر حیات کی طرف بڑھا دی۔

”سر! میں اس کیس کی تحقیقات پھر سے کرنا چاہتا ہوں۔“

اصغر حیات نے فائل اٹھائی۔ تقریباً دس پندرہ منٹ تک اس نے فائل کی ورق گردانی کرنے کے بعد محمود علی کی طرف دیکھا۔ ”اس فائل کو تم اوپن کرنے کی وجہ؟“

”سر! میرے خیال میں یہ پیشہ ور مجرموں کا ایک گینگ ہے جو معاشرے کے سادہ اور بھولے بھالے افراد کو اپنا نشانہ بنا رہا ہے۔“ محمود علی نے پرجوش لہجے میں کہا۔ ”میرا خیال ہے اس وقت یہ کسی نئے جرم کی تیاری کر رہا ہوگا، ان دونوں وارداتوں میں یہ باقاعدہ منصوبے کے تحت اس پر عمل کرتے ہیں، ان کے اندر انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں، یہ درندوں کی سی فطرت رکھنے والے لوگ ہیں، اگر یہ چاہتے تو لڑکیوں کو ایسے ہی چھوڑ کر صرف سامان اور کیش لے جاتے لیکن انہوں نے ان معصوم لڑکیوں کو بھی تباہ کیا، انہیں ایسا شاک دیا کہ اب وہ تاعمر نارمل زندگی نہیں گزار سکتیں، ایسے درندوں کا پکڑا جانا اور انہیں کیفر کردار تک پہنچانا بے حد ضروری ہے سر......!“ محمود علی آخری جملے پر جذباتی ہو گیا تھا۔

ایس پی اصغر حیات نے چند لمحے سوچا پھر پوچھا۔ ”تم اس کیس میں کیا کر سکو گے جبکہ مقامی تھانوں کی پولیس کے علاوہ کرائم برانچ نے بھی ان پر کام کیا تھا؟“

”سر! میں سمجھتا ہوں کہ مقامی پولیس نے صرف خانہ پری کی تھی، ان لوگوں کا انداز عام مجرموں سے قطعی مختلف ہے، یہ سائنٹفک انداز میں کام کرتے ہیں اس لئے ان تک پہنچنے کے لئے عام تفتیش سے ہٹ کر سائنٹفک طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی، کرائم برانچ کے سبحان ربانی نے خاصی محنت سے تفتیش کی لیکن چند پہلوؤں کو وہ نظر انداز کر گیا تھا، ورنہ یہ لوگ اب تک سزا پا چکے ہوتے، مجھے یقین ہے میں ان پہلوؤں پر تفتیش کر کے ان تک پہنچ سکوں گا۔“

ایس پی اصغر حیات نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔ ”ویل ڈی ایس پی......! یہ کیس اب تمہارے سپرد کر رہا ہوں، کوئی مسئلہ ہو تو مجھ سے بات کر سکتے ہو، کیا اس کام کے لئے تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہے؟“

”مجھے ایک ماتحت چاہئے، اس کا انتخاب میں خود کروں گا۔“ محمود علی نے کہا۔

اصغر حیات نے اسے اجازت دے دی ساتھ ہی اسے آفس ورک سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا یعنی اب وہ دفتر آئے بغیر پوری آزادی سے کام کر سکتا تھا۔

اس نے کرائم برانچ کے عملے کا جائزہ لیا اور ایک نوجوان ایس آئی شبیر احمد صدیقی کا انتخاب کر لیا۔ یہ تعلیم یافتہ اور ذہین ایس آئی تھا، اس کے کریڈٹ پر اب تک کئی کامیابیاں درج ہو چکی تھیں، شبیر احمد حال ہی میں فیلڈ ورک سے آیا تھا۔ محمود علی نے اسے اپنے دفتر میں طلب کر لیا۔

”شبیر احمد! ایک کیس کے سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

”آپ حکم کریں سر!“ شبیر احمد نے سیلوٹ کر کے کہا۔

”بیٹھو۔“ محمود علی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا پھر اس نے شبیر احمد کو تفصیل سے اس کیس کے بارے میں بتایا۔ آخر میں وہ بولا۔ ”شبیر احمد! میں تمہاری پوری رضامندی کے ساتھ تمہیں اس کیس میں شامل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہ کام بے حد محنت طلب اور دشوار ہوگا، ہمیں مجرموں تک پہنچنے کے لئے دن کا چین اور رات کی نیند حرام کرنا ہوگی۔“

”سر! میں آپ کے ساتھ ہوں۔“ شبیر احمد کا انداز پرجوش تھا۔ ”معاشرے کے ان ناسوروں کو ختم کرنے کے لئے میں کچھ بھی کرنے کے لئے تیار ہوں سر......!“

”ویری گڈ!“ محمود علی خوش ہو گیا تھا۔ اس نے درست آدمی کا انتخاب کیا تھا پھر اس نے فائل شبیر احمد کی طرف بڑھا دی اور بولا۔ ”اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اور اس کا آرام سے مطالعہ کرو، اس میں سے جو باتیں تمہیں قابل غور محسوس ہوں، انہیں نوٹ کر لو پھر ہم لائحہ عمل طے کر لیں گے۔“

”یس سر......!“ شبیر احمد نے اسے سیلوٹ کیا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد محمود علی نے ریکارڈ سے ان تین مجرموں کی تصاویر نکلوائیں اور لیب کو بھجوائیں کہ ان کے مزید پرنٹس درکار ہیں، اس کے علاوہ اس نے ان تینوں کے فنگر پرنٹس بھی نکلوائے تھے، ان پرنٹس کو انلارج کرانے کی ہدایت دی۔ محمود علی خود بھی فنگر پرنٹ ایکسپرٹ تھا، وہ صرف ان بدکردار لوگوں کو پکڑنا ہی نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں قرار واقعی سزا بھی دلوانا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کسی مجرم کو گرفتار کرنا اور بات ہے اور اسے عدالت سے قرار واقعی سزا دلوانا اور بات...... عدالتی نظام میں موجود سقم اور پولیس کی ناقص تفتیش کا سب سے بڑا فائدہ یہ مجرم اٹھاتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ عدالتی نظام میں تصفیہ طلب مقدمات کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ چالاک مجرم اپنے ہتھکنڈوں سے مقدمات کو اتنا طول دیتے تھے کہ وہ بے جان ہو کر رہ جاتے اور پھر ان کے وکیل بآسانی ان کے حق میں فیصلہ کروا لیا کرتے تھے۔ محمود علی مجرمان کی گرفتاری کے ساتھ ایسے ثبوت بھی چاہتا تھا جو عدالت میں ان کے گھناؤنے جرائم کی قرار واقعی سزا دلوا سکیں۔

اگلے روز شبیر نے بتایا کہ اس نے فائل کا تفصیلی مطالعہ کر لیا اور اس نے کیس کے جو کمزور پہلو نوٹ کیے تھے، وہ تقریباً وہی تھے جو محمود علی نے سوچے تھے۔ ”خوب! گویا تم میرے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے تیار ہو۔“

”یس سر!“ شبیر احمد نے اعتماد سے جواب دیا۔

محمود علی نے فیصلہ کیا تھا کہ جہاں تک ممکن ہوا، وہ پس پردہ رہ کر تفتیش کرے گا۔ اس نے سب سے پہلے شبیر احمد کو اس کام پر لگایا کہ وہ ملیر سٹی کے آس پاس ٹرک کے اڈوں میں اس ٹرک کو تلاش کرے جس کے ذریعے مجرموں نے دو اور تین مارچ کے دوران سامان منتقل کیا تھا۔ اس نے شبیر کو نذر حسین اور عباس کی تصاویر فراہم کر دی تھیں اور ہدایت کی تھی کہ وہ سادہ لباس میں یہ کام کرے اور ممکن حد تک اپنی پولیس کی شناخت ظاہر نہ کرے۔

اس دوران وہ غور کرتا رہا تھا کہ اب مجرمان نے کس علاقے کا رخ کیا ہوگا۔ ایک خیال اسے یہ بھی آیا تھا کہ عین ممکن ہے وہ کراچی سے کسی اور شہر کی طرف چلے گئے ہوں مگر یہ خیال محمود علی کو جچا نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ کراچی ایک وسیع ترین شہر ہے جو ایک طرف پورٹ قاسم اور اسٹیل مل سے لے کر لیاری تک پھیلا تھا تو دوسری طرف گلشن معمار سے بھی آگے آبادیوں سے لے کر ڈیفنس تک وسیع تھا، کسی بھی شہر کے مقابلے میں یہاں چھپنے کے ٹھکانے کہیں زیادہ تھے اور اگر وہ لوگ اس شہر سے جانے کا فیصلہ کر ہی چکے تھے تو ان کے لئے فرنیچر اور بڑا سامان لے جانا قطعی غیر ضروری تھا، وہ اسے فروخت کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے کوئی چیز نہیں بیچی تھی سوائے کار کے...... باقی سارا سامان اور فرنیچر وہ کہیں اور لے گئے تھے۔

دوسرا خیال محمود علی کے ذہن میں یہ آیا تھا کہ اب وہ کہاں گئے ہوں گے؟ پہلی واردات انہوں نے متوسط علاقے میں کی تھی، دوسری واردات نسبتاً پوش علاقے میں کی تھی۔ اس طرح اب تیسری واردات کے لئے وہ کوئی پوش علاقہ منتخب کر سکتے تھے کیونکہ ظفر سے انہوں نے کم از کم چالیس لاکھ روپے اینٹھ لئے تھے، اس رقم سے وہ بآسانی کسی پوش علاقے میں اپنی ساکھ بنا سکتے تھے یا پھر وہ ڈیفنس کے بجائے گلشن اقبال، نارتھ ناظم آباد اور گلشن معمار جیسے علاقوں کی طرف جا سکتے تھے، ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے دور دراز علاقے میں گئے ہوں جو پوش ہونے کے ساتھ کم آبادی والا بھی ہوتا کہ کم سے کم لوگوں سے ان کا رابطہ رہے۔ محمود علی نے شہر کا نقشہ لے کر اس پر نشانات لگائے کہ وہ لوگ اب کہاں جا سکتے تھے۔ اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اس لئے فی الوقت اسے مفروضات کے سہارے ہی آگے بڑھنا تھا۔

اس نے سب سے پہلے گلشن اقبال کے پوش علاقوں کو چیک کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ گزشتہ بیس سال سے اس علاقے میں رہ رہا تھا، اس کے لڑکپن کا آغاز اسی علاقے سے ہوا تھا۔ محمود علی کے بچپن کا ایک دوست اسٹیٹ ایجنسی چلا رہا تھا، محمود علی اس سے ملا، اسے سامنے دیکھ کر رفیع حسن اس سے لپٹ گیا۔

”بڑے دنوں بعد صورت دکھائی ڈی ایس پی صاحب نے؟“

”بکواس مت......تم کون سا روز مجھ سے ملنے آ جاتے تھے۔“ محمود علی نے خفگی سے کہا۔ کچھ دیر اس کی کھنچائی کے بعد وہ کام کی بات پر آ گیا۔ اس نے نذر حسین اور عباس کی تصویریں رفیع کے سامنے رکھ دیں۔

”انہیں پہچانتے ہو؟“

رفیع نے غور سے تصاویر دیکھیں پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میری یادداشت میں ان کے چہرے نہیں، ویسے یہ ہیں کون......؟“

”انسان کے روپ میں درندے۔“ محمود علی نے جواب دیا۔ ”یہ وہ مجرم ہیں جو لوگوں کو شادی کے نام پر فریب دیتے ہیں...... ان کی متاع حیات لوٹ کر لے جاتے ہیں، اب تک یہ دو وارداتیں کر چکے ہیں اور دونوں بار انہوں نے اسٹیٹ ایجنٹس کے توسط سے کرائے پر رہائش حاصل کی۔“

”میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ رفیع نے دریافت کیا۔

”میں یہ تصاویر تمہارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں۔ گلشن اقبال کی حدود میں جتنے بھی اسٹیٹ ایجنٹس ہیں، سب سے تمہاری جان پہچان ہے، تم تصاویر دکھا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ فروری کے آخر یا مارچ کے شروع میں کسی نے تین افراد کے لئے جس میں ایک مرد، ایک عورت اور ایک لڑکا شامل ہیں، رہائش تو حاصل نہیں کی ہے، اس قسم کے جتنے بھی کیس ہوں، مجھے ان کی تفصیل فراہم کرو باقی تفتیش میں خود کر لوں گا۔“

”ایک شرط پر......!“ رفیع نے تصویریں اٹھا لیں۔ ”پولیس کسی اسٹیٹ ایجنٹ کو اس معاملے میں تنگ نہیں کرے گی۔“

”میں وعدہ کرتا ہوں، بشرطیکہ وہ اس معاملے میں جان بوجھ کر ملوث نہ ہوا ہو۔“

رفیع سے مل کر محمود علی نے اطمینان محسوس کیا۔ یہ کام وہ کرتا تو شاید اس میں ہفتوں لگ جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ اسٹیٹ ایجنٹ اسے جان بوجھ کر معلومات فراہم کرنے سے گریز کرتا۔ پولیس کا رویہ اس کے لئے رکاوٹ بن جاتا۔ یہی کام رفیع کم وقت میں اور زیادہ آسانی سے کر سکتا تھا، ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے اسٹیٹ ایجنٹس اس سے کچھ بھی نہیں چھپاتے۔

گلشن اقبال کا کام رفیع کے سپرد کر کے خود محمود علی ڈیفنس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی توجہ کا مرکز نئے آباد ہونے والے علاقے تھے جہاں چھوٹے پلاٹ اور کم قیمت مکانات تھے۔ ظاہر ہے پرانے علاقوں میں جہاں بڑے بنگلے تھے، وہاں زمین کی مالیت ہی کروڑوں میں ہوتی تھی، یہ علاقے ان دھوکے بازوں کے لئے موزوں بھی نہیں تھے، وہ ایسے علاقوں کا انتخاب کرتے تھے جو نسبتاً پوش ہوں، جہاں عام گھرانے آباد ہوں اور جو قدیم معاشرتی اقدار کی وجہ سے اب تک لڑکیوں کے رشتوں کے لئے پریشان ہوں، ایسے ہی علاقے ان درندوں کی شکارگاہ تھے۔

محمود علی پورے دو ہفتے تک ان علاقوں میں اسٹیٹ ایجنٹس کے پاس سرگرم رہا لیکن کہیں سے بھی اسے حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ کئی جگہوں پر ایجنٹس نے اعتراف کیا کہ اس نے تین افراد کے ایسے ہی گھرانے کو مکان یا پلاٹ دلوایا تھا لیکن چیک کرنے پر وہ دوسرے لوگ نکلے تھے۔ دو ہفتے بعد محمود علی نے ڈیفنس کا خیال چھوڑ دیا۔

شبیر احمد اپنا کام نہایت جانفشانی سے کر رہا تھا۔ ملیر سٹی کے آس پاس ٹرک اڈوں کو کھنگالنا آسان نہیں تھا کیونکہ قائد آباد سے ملیر ہالٹ تک بے شمار ٹرک اڈے تھے جن میں سیکڑوں کی تعداد میں لوڈنگ ٹرک کھڑے رہا کرتے تھے، ان کی جانچ کرنا آسان نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ٹرک کسی دوسرے علاقے سے لاتے ہوں، سہراب گوٹھ سے بھی لا سکتے تھے اور شیر شاہ سے بھی...... یہ ایسے دور دراز علاقے تھے جہاں پولیس کا خیال بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اب وہ ٹرک اور اس کا ڈرائیور کراچی میں ہی نہ ہو بلکہ باہر جا چکا ہو۔ شکر، گندم، کپاس اور پھلوں کے سیزن میں ٹرک والے بے حد مصروف ہو جاتے تھے اور دور دراز علاقوں تک سامان لاتے لے جاتے رہتے تھے لیکن ان مفروضات کی وجہ سے کام ترک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تیسرے ہفتے شبیر احمد کو پہلی کامیابی ہوئی۔ اس روز وہ ملیر ہالٹ کے پاس کھڑے ہونے والے ٹرکوں کو چیک کر رہا تھا۔ وہاں پر زیادہ تر چھوٹے لوڈنگ ٹرک کھڑے ہوتے تھے لیکن کچھ بڑے ٹرک بھی تھے۔ شبیر احمد نے ان سے بات کی۔ وہ پہلے تصویر دکھاتا تھا کہ ان میں سے کسی نے ان سے بات تو نہیں کی۔ بیشتر ڈرائیوروں نے تصویر دیکھ کر انکار کر دیا تھا۔ ایک ٹرک ڈرائیور جو باریش اور عمر رسیدہ تھا، اس نے تصویر دیکھ کر پہلی بار اثبات میں سر ہلایا۔

”ام نے اسے دیکھا اے......!“ اس نے نذر حسین کی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

شبیر احمد کا دل ایک لمحے کو رکا تھا۔ وہ اب تک سیکڑوں ٹرک ڈرائیوروں کو یہ تصاویر دکھا چکا تھا اور ان سب نے انکار کیا تھا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے اقرار کیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور کا نام رحیم شاہ تھا۔

”کب دیکھا تھا؟“ شبیر احمد نے بے تابی سے پوچھا۔

رحیم شاہ نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”شاید مارچ کا مہینہ تھا یا فروری کا؟“

”کیا اس نے تمہارا ٹرک کرائے پر لیا تھا؟“

رحیم شاہ نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”یہ ٹھیک آدمی نہیں تھا، ام اور سڑک پار ہوٹل میں بیٹھا تھا، یہ ادر آیا اور ام سے بولا صبح کے وقت ٹرک چاہئے...... سامان ادر سے لے جانا اے، ام نے پوچھا کتنی صبح......! اس نے بولا...... فجر سے پہلے...... ام نے انکار کر دیا، ام اس طرح چوروں کے وقت کام نہیں کرتا، اس نے ام کو عام کرائے سے دوگنا پیش کیا، پر ام نے انکار کیا۔“

شبیر احمد کو ذرا مایوسی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ رحیم شاہ نے اپنا ٹرک استعمال نہیں کیا تھا مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ ”اچھا پھر وہ کدھر گیا تھا، میرا مطلب ہے اس نے کسی اور ٹرک والے سے بات کی ہوگی، کیا تمہیں یاد ہے؟“

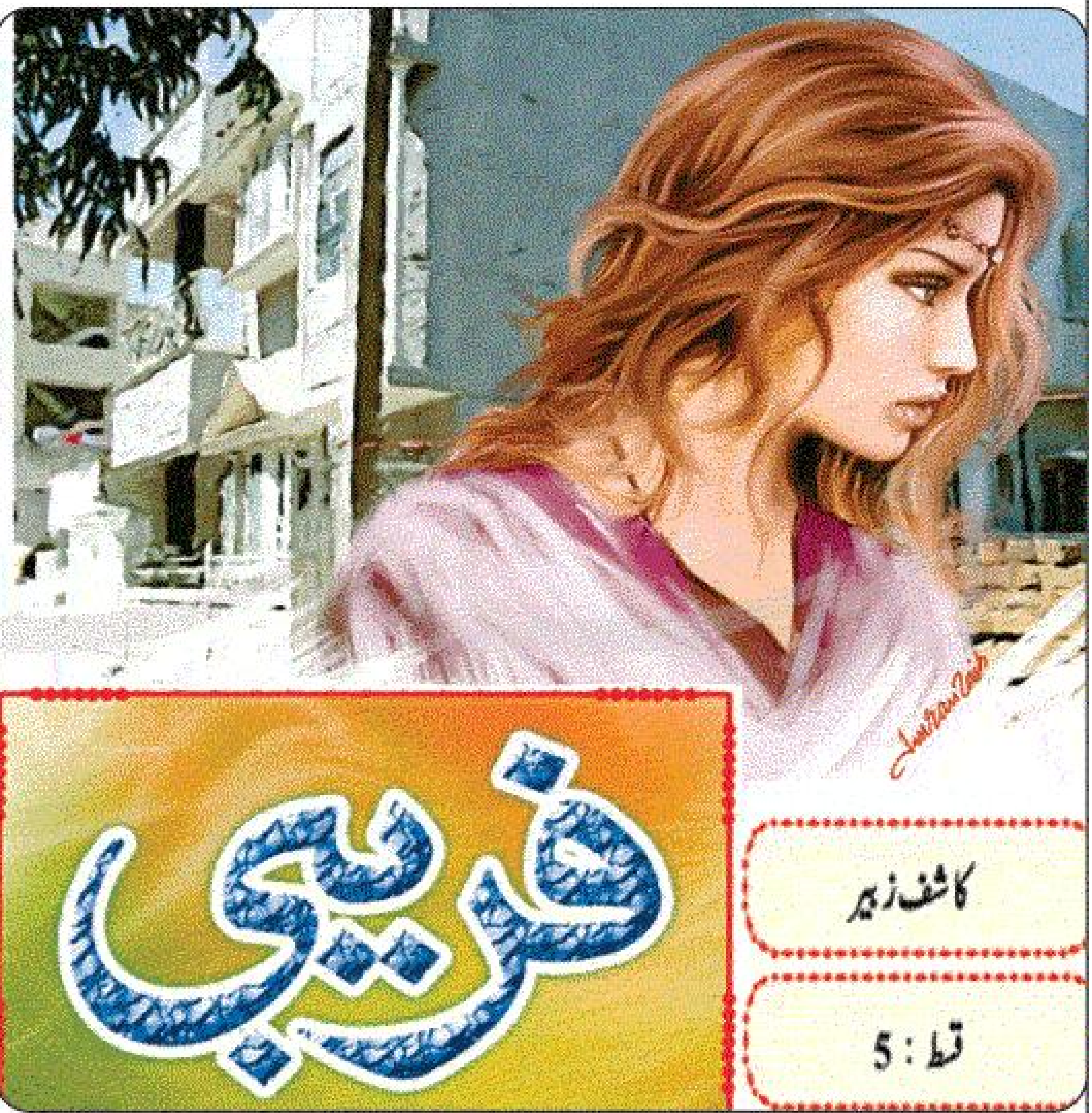
رحیم شاہ سوچتا رہا۔ پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ام کو نہیں یاد کہ وہ کس طرف گیا تھا، پر ایک بات بولو...... اس بندے نے کیا کیا اے؟“

”اس نے ایک خاندان کو شادی کے نام پر دھوکا دیا ہے۔“ شبیر احمد نے رحیم شاہ کی فطرت کا درست اندازہ لگایا تھا۔ اس نے اسے مختصراً بتایا کہ اس شخص اور اس کے بیٹے نے کتنا گھناؤنا جرم کیا ہے۔

(جاری ہے)

حسب توقع رحیم شاہ بے حد متاثر ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "کیا یہ لوگ انسان اے..... ام کو مل جائے تو ام اپنا ٹرک اس پر چڑھا دے..... اتنا گندہ آدمی.....؟"

"رحیم شاہ.....! اس معاملے میں قانون کی مدد کرو، ان درندوں کو پکڑنا ضروری ہے، اس سے پہلے یہ کسی اور شریف آدمی کی عزت برباد کریں۔"



"ام پورا تعاون کرے گا۔" رحیم شاہ نے جوش سے کہا۔ "ام معلوم کرے گا کس نے ان کو اپنا ٹرک دیا، ام پورا پتا چلائے گا، اسے بخشے گا نہیں۔"

شبیر احمد نے رحیم شاہ کا پتا لیا، اس کے ٹرک کا نمبر اور ڈرائیونگ لائسنس نمبر نوٹ کیا۔ اگرچہ رحیم شاہ پوری طرح تعاون کر رہا تھا لیکن پولیس کی تربیت کے مطابق ایس آئی شبیر احمد اس پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے رحیم شاہ سے پوچھا۔ "کیا کل تم اس وقت یہاں ہوگے؟"

"اگر ام کہیں گیا نہیں ہوا تو ادر ای ملے گا۔" رحیم شاہ نے جواب دیا۔ "ویسے ام کوئی سامان چھوڑ کر ادر ہی آتا اے۔"

شبیر احمد نے سر ہلایا۔ "تب میں انتظار کروں گا۔"

"ضرور صاب.....! پر او سکتا اے..... ام کو کئی دن لگ جائے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے..... ہمارا تو کام ہی یہ ہے، پر تم اطمینان رکھو، اگر یہ لوگ پکڑے گئے تو پولیس کی طرف سے تمہیں انعام ملے گا۔"

"ام انعام کیلئے نہیں بلکہ اللہ واسطے کرے گا۔" اس نے خلوص سے کہا تھا۔

شبیر احمد اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ اگرچہ شام ہو چکی تھی لیکن اس نے گھر جانے کے بجائے ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا۔ وہ محمود علی کو اپنی کامیابی کی خبر سنانے کیلئے بیتاب تھا۔

اسے معلوم تھا کہ محمود علی ان دنوں شام سات بجے تک دفتر میں ہوتا ہے کیونکہ دن کے اوقات میں وہ زیادہ تر باہر رہتا تھا۔ شبیر احمد یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسٹیٹ ایجنٹس کو بھی کھنگال رہا تھا، اس نے گلشن اقبال اور ڈیفنس کے اسٹیٹ ایجنٹس کو چیک کیا تھا لیکن اب تک کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہیں آیا تھا۔ شبیر احمد اپنے افسر کے اس کردار سے متاثر تھا کہ وہ اسے ہی نہیں دوڑا رہا تھا بلکہ خود بھی اتنی ہی بھاگ دوڑ کر رہا تھا حالانکہ وہ چاہتا تو آرام سے دفتر میں بیٹھا رہتا اور اس کی تفتیش کے نتائج کا انتظار کرتا۔

حسب توقع محمود علی دفتر میں تھا اور شبیر احمد کے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ کوئی اچھی خبر لایا ہے۔ "کہو شبیر! کیا خبر ہے؟"

"سر.....!" شبیر نے اسے سیلوٹ کیا۔ "آج پہلی بار محنت کا صلہ ملا ہے۔"

پھر اس نے تفصیل سے رحیم شاہ سے ہونے والی ملاقات کی تفصیل سنائی تھی۔ محمود علی بھی پرجوش ہو گیا تھا۔ "شاباش شبیر! یہ کیا ہے نا تم نے کام..... کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ٹرک ڈرائیور رحیم شاہ یہ کام کرے گا؟"

"مکمل طور پر تو نہیں۔" شبیر نے سوچ کر جواب دیا۔ "لیکن اس کی مدد سے ہمیں یہ سراغ تو مل گیا ہے کہ نذر حسین نے سامان لے جانے کیلئے ٹرک اسی جگہ سے لیا تھا، جب رحیم شاہ نے انکار کیا تو اس نے لازماً کسی اور ٹرک والے کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔"

محمود علی بولا۔ "شبیر! اب یہ کام اکیلے تم نہیں کرو گے، کل میں بھی چلوں گا، ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں اور ممکن ہے جس نے یہ کام کیا، سامان لے جانے والا ٹرک ڈرائیور..... تمہیں اکیلا پا کر تم سے بدمعاشی کی کوشش کرے، جیسے ہی اس کی نشاندہی ہوگی، اسے اٹھا لیں گے اور جب تک وہ اس جگہ کا پتہ نہیں بتائے گا جہاں اس نے سامان چھوڑا تھا، اس کی گلو خلاصی نہیں ہوگی، کیا خیال ہے؟"

"میں نے بھی یہی سوچا ہے۔" شبیر نے جواب دیا۔

"تب تم کل شام کو وہاں پہنچ جانا..... میں تمہیں ملیر ہالٹ کے پاس ہی کہیں ملوں گا۔" محمود علی نے اسے سمجھایا تھا۔

☆......☆......☆

شبیر احمد نے رحیم شاہ سے بات کی۔ محمود علی اس سے دس قدم کے فاصلے پر موجود تھا، اگر پاس سے شارع فیصل کا چیختا چنگھاڑتا ٹریفک نہ گزر رہا ہوتا تو وہ ان دونوں کی گفتگو بھی سن سکتا تھا۔ اس نے سادہ گرے رنگ کی پتلون اور ہلکی نیلی قمیض پہن رکھی تھی، آنکھوں پر سیاہ چشمہ تھا، تر و تازہ چہرے کے ساتھ وہ کسی پولیس افسر کے بجائے کھلنڈرا نوجوان لگ رہا تھا، اپنی شرٹ کے نیچے اس نے سروس پستول چھپا رکھا تھا۔

وہ شبیر اور رحیم شاہ کے چہروں کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ ان کے درمیان کیا گفتگو ہو رہی ہے۔ شبیر تقریباً دس پندرہ منٹ تک رحیم شاہ کے ساتھ رہا پھر سڑک کی طرف چل دیا جہاں اس نے اپنی بائیک کھڑی کی تھی۔ محمود علی ٹہلنے کے انداز میں اس کی طرف بڑھا۔

"کیا رہا..... کوئی کامیابی ہوئی؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

شبیر نے سر ہلایا۔ "کسی حد تک..... رحیم شاہ نے کسی کالو مکرانی کا ذکر کیا ہے، اس کا کہنا ہے جس وقت نذر حسین ٹرک لینے کے لئے ادھر آیا تھا تو اس کے علاوہ کالو مکرانی کا ٹرک کھڑا تھا، عین ممکن ہے رحیم شاہ سے مایوس ہو کر اس نے کالو مکرانی سے بات کر لی ہو، رحیم شاہ کا کہنا ہے کہ اسے یاد ہے جب وہ ٹرک کے پاس گیا تو کالو مکرانی کا ٹرک وہاں نہیں تھا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ نذر حسین کے ساتھ ہی گیا تھا یا کسی اور کے ساتھ.....!"

"اس کالو مکرانی کو چیک کرنا ہوگا۔" محمود علی بولا۔ "وہ ملے گا کہاں؟"

"رحیم شاہ نے بتایا ہے کہ وہ ایئرپورٹ کے ساتھ ایک کچی آبادی میں رہتا ہے۔" شبیر نے بتایا۔ "آج کل وہ ملیر سٹی کے ایک اسٹینڈ پر اپنا ٹرک کھڑا کرتا ہے۔"

"اس کے پیچھے بھاگنے کے بجائے اس کے گھر پر اس کا انتظار کیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔" محمود علی کچھ سوچ کر بولا۔

کالو مکرانی گڈانی کا رہنے والا تھا۔ یہاں وہ جس کچی آبادی میں رہتا تھا، وہاں مکرانی چند ایک ہی تھے۔ رحیم شاہ کے خیال کے مطابق کالو مکرانی کوئی اچھا آدمی نہیں تھا، وہ چرس اور شراب کا عادی تھا، لوگ عام طور پر اس کے منہ لگنے سے گریز کرتے تھے۔ رحیم شاہ نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ رات گیارہ بجے تک اپنا ٹرک اڈے پر ہی چھوڑ کر چلا جاتا تھا۔ اکثر ٹرک والے اپنے ٹرک اسٹینڈز پر ہی رکھتے تھے۔ وہ عام طور پر چھوٹی آبادیوں میں رہا کرتے تھے جہاں ان کے ٹرکوں کو کھڑے کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔

"میرا خیال ہے ہم بارہ بجے تک اس کے گھر پہنچیں۔" محمود علی نے کہا۔ "اس وقت تک وہ ضرور گھر آ چکا ہوگا۔"

"تب تک آپ اجازت دیں تو میں گھر ہو آؤں۔" شبیر احمد نے اجازت چاہی۔

"کیوں نہیں۔" محمود علی نے اجازت دے دی۔ وہ خود بھی گھر جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ "لیکن ٹھہرو.....! پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے رحیم شاہ کو اب تک ہونے والی بات راز میں رکھنے کو کہا یا نہیں؟"

"بالکل.....! وہ خود بھی خاصا سمجھدار آدمی ہے۔" شبیر احمد نے جواب دیا۔

محمود علی نے گھر کا رخ کیا۔ اکتوبر کا آخر تھا اور شام کے وقت موسم خنک ہو جاتا تھا۔ شیما والے کیس کو سات مہینے ہونے کو آ رہے تھے اور اب تک پولیس مجرموں پر ہاتھ ڈالنے میں ناکام رہی تھی۔ محمود علی کے خیال میں اس میں جتنا دخل پولیس کی نااہلی کا تھا، اتنا ہی دخل مجرموں کی چالاکی اور ذہانت سے کام کرنے کا بھی تھا۔ انہوں نے اپنے پیچھے کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ خاصی عرق ریزی کے بعد ان لوگوں کا موہوم سا سراغ ہاتھ لگا تھا۔ اگر وہ کالو مکرانی کی مدد سے ان کے ٹھکانے تک پہنچ جاتے تو پھر باقی کام آسان تھا۔

☆......☆......☆

کالو مکرانی جھگڑالو طبیعت کا آدمی تھا۔ اس کے جاننے والے اس کے منہ لگنے سے گھبراتے تھے۔ ایک زمانے میں وہ ڈرائیور کا کام کرتا تھا پھر اس نے ہاتھ مارا، سیٹھ کے مال میں چھپا کر پشاور سے چرس لے آیا، قسمت اس کے ساتھ تھی، راستے میں کہیں پکڑا نہیں گیا، یہ چرس لا کر اس نے کراچی میں دس گنا داموں بیچ دی اور اس سے حاصل ہونے والی رقم سے ایک پرانا ٹرک خرید کر خود چلانے لگا۔ اس کے سیٹھ کو جاننے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ کالو مکرانی نے یہ سب کس طرح کیا تھا لیکن وہ قتل و غارت گری کا قائل نہیں تھا، کوئی اور ہوتا تو کالو مکرانی کو ٹرک سمیت سمندر میں پھنکوا دیتا، البتہ اسے باہر کا کام ملنا بند ہو گیا تھا، مجبوراً اسے کراچی میں لوڈنگ کا کام کرنا پڑا۔ پیسے کے لالچ میں وہ ہر کام قبول کر لیتا تھا۔

اس رات وہ بارہ بجے کے قریب گھر پہنچا۔ ابھی اس نے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ نہ جانے کہاں سے دو افراد نکل کر اس کے دائیں بائیں آ گئے۔ اس سے پہلے وہ شلوار کے نیفے میں اڑسے ہوئے پستول پر ہاتھ ڈالتا، ایک نال آ کر اس کی گردن سے لگ گئی اور ایک پراسرار آواز نے کہا۔ "خاموشی سے اندر چلو، کوئی غلط حرکت مت کرنا، ہم پولیس والے ہیں۔"

پولیس کا نام سن کر اس کے ہاتھ، پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ بلا چوں چرا تالا کھول کر اندر آ گیا۔ اس کے بیوی، بچے اس کے ماں، باپ کے ساتھ گڈانی میں ہی رہتے تھے۔ اپنے غلط کاموں کی وجہ سے وہ انہیں یہاں نہیں رکھتا تھا، اس دو کمروں کے مختصر سے مکان میں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔

اندر آ کر اس نے ان دونوں کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے ان کا تعلق پولیس سے نہ ہو۔ اس نے دوبارہ غیر محسوس انداز میں نیفے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن شبیر نے بھانپ کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور پھر اس کی شلوار کے نیفے سے پستول نکال لیا۔ "خوب.....!" محمود علی نے پستول دیکھ کر کہا۔ "اس کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟"

"ہم کو یقین آ گیا۔" کالو مکرانی نے ہاتھ جوڑے۔ "پہلے ہم سمجھا تھا کہ تم پولیس والا نہیں ہے ڈرے۔"

"اگر تمہارے پاس اس کا لائسنس نہیں ہے تو سمجھ لو تم تین سے پانچ سال کے لئے جیل جا سکتے ہو۔" محمود علی نے سنجیدگی سے کہا۔

کالو مکرانی کا سیاہ چہرہ بتا رہا تھا کہ یہ ہتھیار غیر قانونی ہے۔ محمود علی نے اسے دھمکایا۔ "کیا خیال ہے تھانے لے چلیں؟"

"نہیں مائی باپ.....!" کالو مکرانی نے دوبارہ ہاتھ جوڑے۔ "تم جو کہو گے میں ماننے کے لئے تیار ہوں۔"

"اگر تم نے ہمارا کام کر دیا تو یہ پستول ہم بھول جائیں گے۔" شبیر احمد نے اس سے کہا۔

"بولو صاب!" کالو مکرانی کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ "اگر ایسا ہے تو ہم تمہارے لئے جان بھی دے گا۔"

"فروری کے آخر یا مارچ کے شروع میں یہ شخص تمہارے پاس آیا تھا۔" شبیر احمد نے نذر حسین کی تصویر اس کے سامنے کر دی تھی۔ "ٹرک کرائے پر لینے..... اس نے جامعہ ملیہ روڈ کے ایک بنگلے سے سامان اٹھوانا تھا، رات کے آخری پہر میں۔"

کالو مکرانی نے غور سے دیکھا اور پھر سر ہلایا۔ "ہم کو یاد ہے، اس نے ہم کو دو گنا کرایہ دیا تھا۔"

شبیر احمد اور محمود علی کے لئے اپنے جوش پر قابو پانا دشوار ہو گیا تھا۔ محمود علی نے کہا۔ "یہ شخص سامان کہاں لے گیا تھا؟"

"گلشن معمار۔" کالو مکرانی نے کہا۔

"کس پتے پر.....؟"

"یہ تو ہم کو نہیں معلوم۔" کالو مکرانی نے اس سادگی سے کہا کہ شبیر احمد نے اسے ایک زبردست لات رسید کی۔ وہ اوندھے منہ فرش پر گرا اور وہیں سے چلانے لگا۔ "ہم کو مت مارو..... ہم نے ٹھیک کہا ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہیں پتے کا علم نہ ہو۔" محمود علی نے غرا کر کہا۔

"ہمارا ٹرک سپر ہائی وے پر خراب ہو گیا تھا، انجن ٹھیک ہونے میں بہت دیر لگتا، اسے ورکشاپ لے جانا ضروری تھا اس لئے اس شخص کا بیٹا جا کر دوسرا ٹرک لے آیا، اس نے چار مزدور بھی کئے تھے سامان اٹھانے والے، وہ ساتھ گئے تھے، انہوں نے سامان ٹرک میں ڈالا تھا اور لے گئے تھے، میں اپنے ٹرک میں لگ گیا تھا، معاوضہ مجھے پورا دیا گیا تھا۔"

شبیر اور محمود علی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "کیا تمہیں وہ پتا یاد نہیں ہے جس پر سامان پہنچانا تھا؟" شبیر نے پوچھا۔

"اس کا ضرورت نہیں تھا صاب!" کالو مکرانی فرش سے اٹھا۔ "سامان کا مالک ہمارے ساتھ بیٹھا تھا، وہ راستہ جانتا تھا۔"

"پھر بھی اس نے کوئی ایسی بات کی ہو جس سے لگتا ہو کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے؟"

کالو مکرانی نے ذہن پر زور دیا۔ "بس اتنا یاد ہے لڑکے کے باپ نے کہا تھا کہ گیٹ والے راستے سے اندر نہیں جانا، اس سے آگے والے راستے سے اندر جانا ہے۔"

"آگے والا راستہ.....؟" شبیر احمد نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"میں سمجھ گیا..... یہ مرکزی سڑک کی بات کر رہا ہے جو اگلے سیکٹر میں جاتی ہے۔" محمود علی نے کہا۔ پھر کالو مکرانی سے پوچھا۔ "دوسرا ٹرک کس کا تھا؟"

"ہم نہیں جانتا۔" کالو مکرانی نے سر ہلایا۔ "اس وقت ہم کو اپنا ٹرک کا فکر کھائے جا رہا تھا۔"

شبیر اور محمود علی ایک گھنٹے تک اس سے جرح کرتے رہے تھے لیکن اس سے بس اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا۔ آخرکار انہیں ماننا پڑا کہ وہ اس سے مزید کچھ اور نہیں اگلوا سکتے۔ جانے سے پہلے محمود علی نے اس سے کہا تھا کہ اس کی بچت اس میں ہے وہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وہ لوگ سامان لے کر کہاں گئے تھے، اگر وہ لوگ گلشن معمار میں نہیں ملے تو وہ دوبارہ آئیں گے اور اس بار اسے تھانے لے جائیں گے۔ اس پر دباؤ رکھنے کے لئے محمود علی نے اس کا پستول خالی کرا کے زبردستی اس کی انگلیوں کے نشانات اس پر بنوائے اور پھر رومال میں لپیٹ کر اسے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ "اب اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو جیل جانے کے لئے تیار رہنا۔" محمود علی بولا۔

"تم بھاگ بھی نہیں سکتے۔" شبیر احمد نے اسے یاد دلایا۔ "ٹرک نمبر ہمارے پاس ہے۔"

"لیکن اگر تم نے یہ کام کر دیا تو میں تمہارا پستول واپس کر دوں گا۔" محمود علی نے وعدہ کیا۔

"میں پوری کوشش کرے گا۔" کالو مکرانی نے متوحش لہجے میں کہا۔ فنگر پرنٹ والا پستول ان کے پاس ہونے کے خیال سے اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ اسے پولیس والوں پر بالکل اعتبار نہیں تھا، وہ کوئی قتل بھی اس پر ڈال سکتے تھے، اس طرح فنگر پرنٹس کی وجہ سے پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں پڑ سکتا تھا۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ وہ ٹرک بیچ کر فرار نہ ہو جائے، انہوں نے اس کے ٹرک کے اصلی کاغذات بھی قبضے میں لے لئے، وہ فوٹو کاپی کی مدد سے اپنا کام چلا سکتا تھا لیکن حقیقی کاغذات کے بغیر اپنا ٹرک نہیں بیچ سکتا تھا۔

باہر آ کر محمود علی نے گہری سانس لی۔ "وہ درندے اس دور دراز بستی میں جا کر چھپ گئے ہیں، اب انہیں وہاں تلاش کرنا پڑے گا۔"

"ہم کر لیں گے سر.....!" شبیر احمد نے پرعزم لہجے میں کہا تھا۔

☆......☆......☆

عثمان احمد گزشتہ دس سال سے گلشن معمار میں آباد تھے۔ ان کا سبزی منڈی میں وسیع کاروبار تھا۔ جب نئی سبزی منڈی کا غلغلہ بلند ہوا تو انہوں نے سب سے پہلے یہاں جگہ حاصل کی تھی لیکن گلشن معمار اس لئے نہیں آئے تھے کہ یہ نئی سبزی منڈی کے نزدیک تر تھا بلکہ انہیں اپنی آب و ہوا اور اچھی سہولتوں کے ساتھ سبزہ و گل کی وجہ سے یہ بستی بھا گئی تھی۔ انہوں نے دو سو چالیس گز کا پلاٹ اس وقت ہی لے لیا تھا جب یہاں سوائے خالی پلاٹوں کے کچھ نہیں تھا۔

دس سال بعد جب گلشن معمار اچھا خاصا آباد ہو چکا تھا تب انہوں نے اپنے پلاٹ پر خوبصورت بنگلہ نما دو منزلہ مکان بنوایا اور اپنے چھ بچوں اور ان کی ماں سمیت یہاں منتقل ہو گئے، تب سے وہ مطمئن اور خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے دو بڑے لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں۔

عثمان احمد کا باپ پھل فروش تھا۔ پرانی سبزی منڈی میں اس کی چھوٹی سی دکان تھی جو ہر قسم کے پھلوں سے بھری رہتی تھی، موقع کی جگہ ہونے کی وجہ سے خوب چلتی تھی، اس دکان کی کمائی سے اس نے اپنے پانچ بچوں کی پرورش کی، عثمان احمد نے کالج میں تعلیم حاصل کی، اسے اس وقت کچھ شاعری کا شوق ہوا تھا لیکن جب باپ نے اسے پکڑ کر دکان پر بٹھایا تو اسے کاروبار میں دلچسپی لینا ہی پڑی تھی۔

باپ چھوٹے پیمانے پر کام کرتا تھا۔ عثمان نے ایک سوزوکی حاصل کی اور دکانوں پر مال سپلائی کرنے لگا۔ پھر اس نے منڈی میں آنے والے پھل کی نیلامی میں حصہ لینا شروع کیا، اس طرح پھل کم داموں مل جاتا تھا۔ آمدنی بڑھی تو باپ نے منڈی میں ایک بڑی جگہ لے لی اور ہول سیل کا کام کرنے لگا۔ دکان اس نے عثمان کے حوالے کر دی تھی، اپنے چھوٹے بھائی کو عثمان نے سڑک کے پار فروٹ جوس کی دکان کھلوا دی۔

عثمان کے شامل ہوتے ہی کاروبار تیزی سے ترقی کرنے لگا تھا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی تھے اور پھر دو چھوٹی بہنیں..... باپ نے عثمان کی شادی کی اور اسے الگ کاروبار کرا دیا، اس طرح باقی بھائیوں کو بھی الگ الگ کام کروا دیے تھے۔ چند سالوں میں عثمان نے اپنا کاروبار پوری طرح سیٹ کر لیا تھا۔ ان ہی دنوں اس نے گلشن معمار میں پلاٹ لیا اور یہاں مکان بنوایا تھا۔

اس کے دونوں بڑے بیٹے اسد اور امجد اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ دو سال پہلے اس نے دونوں بیٹوں کی شادیاں کر دی تھیں۔ چار بیٹیوں میں سب سے بڑی نوشابہ تھی۔ وہ گریجویشن کر رہی تھی، اس سے چھوٹی ماریہ اور نوریہ انٹر میں تھیں اور سب سے چھوٹی میمونہ میٹرک کر رہی تھی۔

نوشابہ ابھی صرف بیس سال کی تھی لیکن عثمان کی بیوی کو اس کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ اس نے نوشابہ کے لئے موزوں رشتے کی تلاش شروع کر دی تھی، پیسے کی کمی نہیں تھی اس لئے اس کی نظریں بھی اونچے گھرانے کے رشتوں پر تھیں۔ کئی رشتے اس نے اس وجہ سے مسترد کر دیے تھے کہ وہ متوسط طبقے کے تھے۔ عثمان کو کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ اس کے خیال میں نوشابہ ابھی پڑھ رہی تھی اس لئے رشتے کا کام اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد بھی کیا جا سکتا تھا۔ گریجویٹ ہونے میں ابھی ایک سال باقی تھا۔

اس صبح وہ سبزی منڈی جانے کے لئے نکل رہا تھا۔ اس کے پاس چھوٹی جیپ تھی۔ اس پر منڈی کے کچے راستوں پر سفر کرنا آسان ہوتا تھا۔ بڑے بیٹے کے پاس کار تھی اور چھوٹے کے پاس موٹر سائیکل..... اسے کار کے بجائے بائیک اچھی لگتی تھی ورنہ عثمان اسے بھی کار دلوا دیتا۔ وہ جیپ لے کر باہر نکلا تو سامنے والے بنگلے کے سامنے کھڑے ٹرک سے سامان اتر کر اندر جا رہا تھا۔ اس بنگلے کا مالک گلشن اقبال میں رہتا تھا، اس کا یہ بنگلہ زیادہ تر کرائے پر اٹھا رہتا تھا۔ عثمان نے جیپ روکی اور اتر کر ٹرک کے پاس کھڑے نوجوان کے پاس آیا۔ وہ سامان اتارنے والے مزدوروں کو ہدایات دے رہا تھا۔

"آرام سے..... کسی چیز کو نقصان ہوا تو انعام نہیں ملے گا۔"

"برخوردار.....!" عثمان نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "میں سامنے والے بنگلے میں رہتا ہوں، کیا آپ لوگ کرائے پر آئے ہو؟"

اس خوش شکل نوجوان نے گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ "جی انکل.....! میں اور میرے امی، ابو اس بنگلے میں شفٹ ہو رہے ہیں، کچھ سامان کل ہی آ گیا تھا، یہ بھاری سامان ہے جو آج آیا ہے۔"

"امی، ابو کہاں ہیں تمہارے.....؟"

"جی وہ ابھی پرانے گھر میں ہیں، کچھ سامان سمیٹنا ہے، مالک مکان سے حساب کتاب کرنا ہے۔"

"اچھا برخوردار.....! کسی شے کی ضرورت ہو تو یہ سامنے میرا مکان ہے، بلاتکلف دروازہ کھٹکھٹا کر مانگ لینا، میں چلتا ہوں۔"

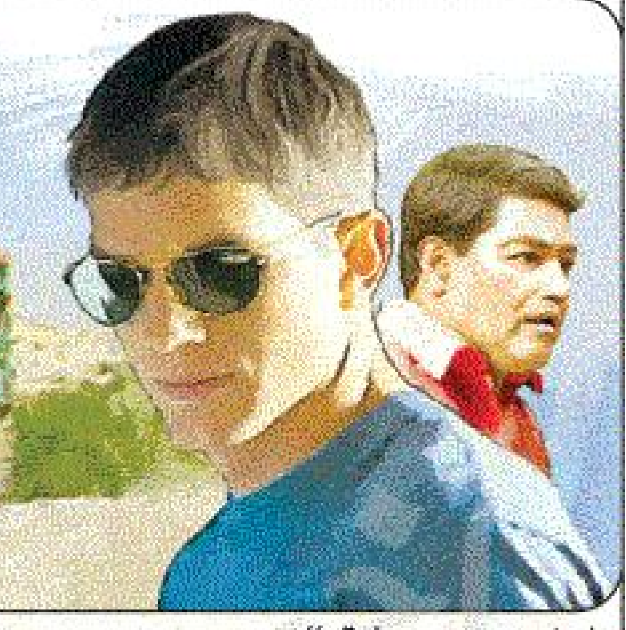
"جی ضرور انکل!" اس نے فوراً کہا تھا۔

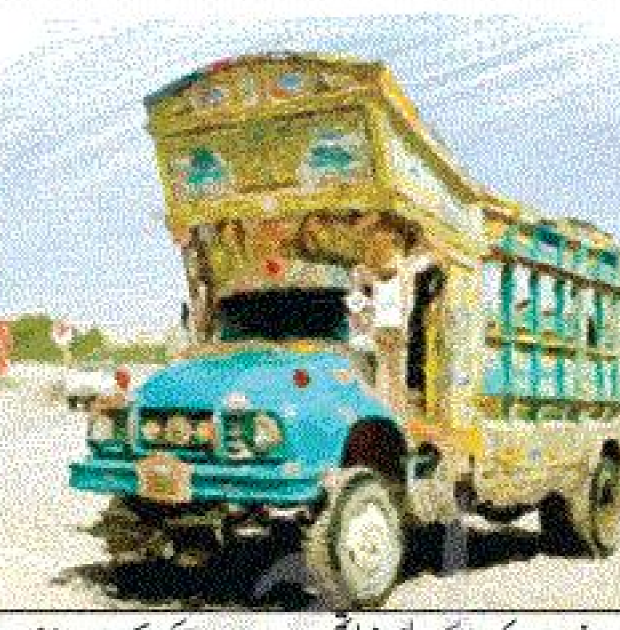
جانے سے پہلے عثمان نے اپنی بیوی نیرہ کو بھی نئے آنے والے پڑوسیوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔

پرانے خیالات کی وجہ سے نیرہ زیادہ سوشل نہیں تھی لیکن پڑوسیوں سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ وہ ان کا خیال بھی رکھتی تھی اور ان کے حقوق بھی ادا کرتی تھی۔ اسے پتا چلا تو وہ خود نوجوان کے پاس آئی۔ اسے ناشتے کی پیشکش کی، اس نے معذرت کی۔ نیرہ نے اس کے اور مزدوروں کے لئے چائے بھجوا دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکے کے ماں، باپ بھی اسی روز آ جائیں گے لیکن وہ نہیں آئے اس کے بجائے لڑکا شام کو گھر بند کر کے چلا گیا تھا۔

اگلی صبح جب نیرہ سبزی والے سے سبزی لے رہی تھی، انہوں نے ایک ٹیکسی کو بنگلے کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس سے ایک کلین شیو بوڑھا، ایک بوڑھی عورت اور وہی نوجوان اترے تھے۔ انہوں نے ہاتھوں میں خاصا سامان اٹھا رکھا تھا، مین گیٹ کا تالا کھول کر وہ اندر چلے گئے۔ نیرہ نے اندر جا کر ناشتہ بناتی نوشابہ سے تین آدمیوں کا ناشتہ بنانے کو کہا تھا۔ آج اتوار تھا اور چھٹی والے دن ناشتہ نوشابہ اور نیرہ مل کر بناتی تھیں۔ بہوؤں کا پورشن الگ تھا، وہ اوپر رہتی تھیں اور ان کا کچن کامن تھا باقی دنوں میں نیرہ ناشتہ اور دوپہر کا کھانا بناتی تھی۔

ناشتہ اور چائے اس نے ملازمہ کے ہاتھ سامنے والے بنگلے میں بھجوادی۔
انہوں نے ملازمہ کے ذریعے شکریہ کہلوا بھیجا تھا۔ تھوڑی دیر بعد خاتون خود آگئی۔ اس نے ناشتے کے برتن اٹھا رکھے تھے۔
نیرہ شرمندہ ہوگئی۔ ''ارے آپ نے کیوں زحمت کی...... میں ملازمہ کو بھیجنے والی تھی۔''
''ارے نہیں بہن......! میں نے سوچا شکریے کے ساتھ برتن خود لے جاؤں...... بہت اچھا ناشتہ تھا۔''





''میری بڑی بیٹی نے بنایا تھا...... ارے آئیں اندر آئیں...... باہر کیوں کھڑی ہیں؟'' اس نے خاتون کو اندر آنے کا راستہ دیا۔
ذرا سی دیر میں دونوں خواتین آپس میں بے تکلف ہوگئی تھیں۔ نوشابہ نے تازہ چائے لاکر دی تو نیرہ نے اس کا تعارف نئی پڑوسن سے کرایا۔ اس نے تعریفی نظروں سے نوشابہ کی طرف دیکھا۔ ماشاء اللہ کیا پیاری صورت ہے، اللہ نظر بد سے بچائے، کیا کرتی ہو بیٹی......؟
''جی میں گریجویشن کر رہی ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''شام کو درس قرآن کی کلاس لیتی ہوں۔''
''ماشاء اللہ...... ماشاء اللہ! آج کل کی لڑکیوں کی ایسی سوچ کہاں ہوتی ہے۔''
''ایسی بات نہیں ہے آنٹی! میں جہاں درس قرآن میں جاتی ہوں، وہاں پڑھانے والی اور پڑھنے والی زیادہ تر تو جوان ہی ہیں، ان میں چند ایک ہی معمر ہوتی ہیں۔''
''ہاں بہن......! یہ تو ہے آج کل نئی نسل میں مذہب کا ذوق ہم بوڑھوں سے کچھ زیادہ ہی ہے۔'' نیرہ نے بیٹی کی تائید کی۔
''ہاں یہ تو ہے۔'' خاتون کھسیا گئی جس نے اپنا نام رقیہ خاتون بتایا تھا۔ ''اچھا میں چلتی ہوں، آپ بھی آیئے گا ہمارے ہاں، ابھی دو تین دن تو سامان سیٹ کرنے میں لگیں گے۔''
''ہماری مدد کی ضرورت ہو تو ضرور بتایئے گا۔'' نیرہ نے خلوص دل سے کہا۔
''کیوں نہیں نیرہ بہن! آخر پڑوسی ہی پڑوسی کے کام آتا ہے۔'' رقیہ نے جواب دیا۔
رقیہ نے اپنے بارے میں بتایا تھا کہ اس کے میاں اسلام آباد میں سرکاری افسر رہے تھے، ان کا نام عبدالباسط تھا، اس کے بیٹے کا نام راحیل تھا، ریٹائرمنٹ کے بعد عبدالباسط نے کراچی میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا تھا، پہلے وہ گلشن اقبال میں آکر رہے تھے لیکن وہاں پڑوس اچھا نہیں تھا اس لئے وہ علاقہ چھوڑ کر گلشن معمار چلے آئے، فی الوقت وہ کرائے پر تھے لیکن ان کا ارادہ جلد اپنا مکان لینے کا تھا، ساتھ ہی وہ کوئی موزوں کاروبار بھی کرنا چاہتا تھا۔ نیرہ نے کہا تھا کہ اس معاملے میں وہ چاہیں تو اس کے شوہر سے مشورہ کر سکتے ہیں، وہ کاروباری آدمی ہیں، آپ کو بہتر مشورہ دے سکتے ہیں۔
اگلے ایک مہینے میں دونوں خاندانوں میں روابط تیزی سے بڑھے تھے۔ خاص طور سے راحیل کی عثمان احمد کے بیٹوں اسد اور امجد سے گہری دوستی ہوگئی تھی۔ اکثر وہ ان کے پاس ان کے دفتر چلا جاتا تھا۔ عثمان احمد پھلوں کا ہول سیلر تھا، اس نے نئی سبزی منڈی میں کافی سرمایہ کاری کی تھی، اندرون ملک اس کے نمائندے کام کرتے تھے جو اس کی طرف سے پھل کے باغات کی نیلامی میں حصہ لیا کرتے تھے اور پھر پھل ٹرکوں میں بھر کر کراچی روانہ کرتے تھے جو عثمان احمد کے اپنے گودام میں ذخیرہ کیا جاتا تھا۔ اس نے اندرون منڈی میں خاصا بڑا گودام بنا رکھا تھا۔ عبدالباسط اور راحیل ان کے کام میں بھرپور دلچسپی لے رہے تھے، خاص طور سے راحیل تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ عثمان احمد کے خیال میں اس میں کاروباری صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔
عبدالباسط نے اس سے کہا۔ ''میرے پاس دس بارہ لاکھ روپے ہیں جو میں کسی کاروبار میں لگانا چاہتا ہوں۔''
ان دنوں آم کا سیزن نزدیک تھا اس لئے عثمان احمد نے اسے مشورہ دیا۔ ''آپ آم کے ٹھیکے لیں۔''
''مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔'' عبدالباسط نے مجبوری ظاہر کی۔
''آپ فکر نہ کریں، میرے اور لڑکوں کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں، بس اس میں محنت کی ضرورت ہوتی ہے، مئی میں میرے ساتھ میرپور خاص چلیں اور آم کی نیلامی میں حصہ لیں، ایک مہینے کے اندر کم از کم دوگنا کما لیں گے۔''
''نہیں......؟'' عبدالباسط کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''یعنی دس کے بیس لاکھ روپے!''
عثمان احمد مسکرایا۔ ''میں پوری رقم لگانے کا مشورہ نہیں دوں گا، پہلے چھوٹے پیمانے پر کریں کہ نقصان کا خطرہ ہو تو برداشت کر سکیں۔''
''اس میں کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟''
''بے شمار خطرے ہیں، پھل خراب اور داغی نکل آتا ہے، بعض اوقات پھل اتنا آتا ہے کہ منڈی میں بہتات کی وجہ سے قیمت گرانی پڑتی ہے، نقصان ہو جاتا ہے، آتے ہوئے راستے میں پھل چوری ہو جاتا ہے۔''
''اس قسم کے خطرات تو ہر کاروبار میں ہوتے ہیں، مجھے وہ ٹھیکے چاہئیں جو آپ مجھے دلائیں گے، میں زیادہ نفع کا لالچ بھی نہیں کروں گا بس میں جو مال لاؤں، وہ بغیر نقصان کے نکل جائے، اسے ایک تجربہ سمجھ کر کروں گا۔''
''ایک اور جگہ ہے سرمایہ کاری کے لئے، میں پھلوں کے لئے شیڈز بنوا رہا ہوں جہاں جگہ کرائے پر دی جائے گی، منڈی میں جن لوگوں کے گودام نہیں ہوتے، وہ ان شیڈز میں جگہ کرائے پر لے کر کام چلاتے ہیں، اس کام میں بھی اچھی آمدنی ہے، آپ چاہیں تو میرے ساتھ مل کر یہ کام کر سکتے ہیں اس طرح مجھے ایک آدمی مل جائے گا جو اس کام کی نگرانی کر سکے گا، گودام میں دیکھتا رہوں گا اور بزنس لڑکوں نے سنبھال رکھا ہے۔''
عبدالباسط نے جا کر جگہ دیکھی۔ یہ منڈی کے کونے پر تھی اور آمدورفت کے لحاظ سے اچھی جگہ تھی۔ یہاں عثمان احمد نے کوئی چار سو گز جگہ لے رکھی تھی اور اس پر کھلے شیڈز بنوا رہا تھا، آفس کے لئے ایک مختصر سا کمرہ الگ تھا، پلرز ڈال کر ان پر چھت کھڑی کی جا رہی تھی، تین طرف دیوار تھی اور چوتھی طرف جہاں سے آمدورفت کا کام لیا جاتا تھا، کھلی تھی۔ خاصی بڑی سرمایہ کاری تھی، صرف جگہ ہی دس لاکھ روپے مالیت کی تھی اور اس پر پانچ لاکھ خرچ آ رہا تھا۔ عبدالباسط کو کام پسند آیا۔
اس نے عثمان احمد سے پوچھا۔ ''میں کتنی رقم لگاؤں؟''
''رقم اپنی مرضی سے لگائیں، اصل میں تو مجھے آپ کی معاونت کی ضرورت ہے، اس لحاظ سے آمدنی میں حصہ طے کر لیں گے لیکن کاروبار میرا ہی ہوگا۔'' عثمان احمد نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''آپ جب چاہیں اپنی رقم نکال لیں۔''
''میں بھی فی الوقت مکمل طور پر خود کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔'' عبدالباسط نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تھا۔ کلین شیو چہرے، سر کے سیاہ کٹے ہوئے چھوٹے بالوں اور آنکھ پر گہرے رنگ کے شیشوں والی عینک کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کم نظر آتا تھا، اس کا ناپا تلا لہجہ کسی سرکاری افسر کا سا ہی تھا۔ ''میں آپ کے ساتھ تین لاکھ تک لگا سکتا ہوں، ہاں دفتر کے لئے میری خدمات مکمل طور پر حاضر ہیں۔''
''اس صورت میں نفع کا چالیس فیصد آپ کا ہوگا۔'' عثمان احمد نے فوری فیصلہ کر لیا۔ اسے خوشی تھی کہ اس کام کے لئے ایک شخص مل گیا تھا جو سرمایہ کاری بھی کر رہا تھا۔ درحقیقت عثمان احمد کو معاونت کے ساتھ سرمائے کی بھی ضرورت تھی، اس کے پاس جو پیسہ تھا، وہ رننگ میں تھا، خاصی بڑی رقم بیوپاریوں اور ریٹیلرز کے پاس پھنسی ہوئی تھی جو عام طور سے سیزن کے آخر میں ملا کرتی تھی۔
شیڈز کے کام کے لئے رقم کی ضرورت تھی اور سب سے بڑھ کر اسے آم کا ٹھیکہ لینے کے لئے پیسے چاہئے تھے۔ اگلے ایک ہفتے میں ان دونوں میں باقاعدہ معاہدہ ہوگیا تھا۔ عبدالباسط نے عثمان احمد کے اس کام میں تین لاکھ روپے لگائے تھے۔ پیسہ ملتے ہی شیڈز کے کام کی رفتار میں تیزی آگئی تھی۔ عثمان احمد کو توقع تھی کہ وہ جب تک آم لے کر واپس آئے گا، شیڈز مکمل ہو چکے ہوں گے۔
مئی کے آخر میں وہ روانہ ہوئے۔ عثمان احمد کی جیپ طویل فاصلوں اور خراب سڑکوں کے لئے مثالی تھی۔ وہ پورا دن سفر کر کے میر پور خاص جا پہنچے۔ وہاں حنیف محمد جو عثمان احمد کا ایجنٹ تھا، ان کا ان کے گھر ٹھہرے تھے۔
مختلف اقسام، سائز اور معیار کے آم کی نیلامی جاری تھی۔ فضا میں آم کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ عبدالباسط اور عثمان احمد نے دس دنوں میں کئی نیلامیوں میں حصہ لیا۔ عبدالباسط نے عثمان احمد اور حنیف محمد کے مشورے پر تین لاکھ تیس ہزار روپے کا ایک سودا کر لیا، اس کے بعد وہ آم اتروا کر پیک کروانے میں لگ گئے۔
درجنوں کے حساب سے مزدور اس کام میں لگے ہوئے تھے۔ بے پناہ گرمی کے باوجود عثمان اور عبدالباسط نے خود کھڑے ہو کر سارا آم اتروایا تھا۔ اس معاملے میں لاپروائی کی جائے تو مزدور توجہ سے پھل نہیں اتارتے، اسے چوٹ لگتی ہے جو بعد میں داغ بن جاتی ہے، اس طرح پھل کی کوالٹی خراب ہوتی ہے۔ پھل اتروا کر پیٹیوں میں پیک کروا کے اور اسے ٹرکوں پر بار کر کے کراچی کے لئے روانہ کرنے کے بعد وہ جون کے دوسرے ہفتے میں خود بھی کراچی روانہ ہو گئے تھے۔
راستے میں عثمان احمد نے اسے مبارکباد دی۔
''آپ نے بہت اچھا پھل لیا ہے، اتنی اچھی کوالٹی کا آم میں نے دو سال سے نہیں دیکھا تھا، جولائی کے آخر میں بڑا آم اترے گا، میں سوچ رہا ہوں اگر پیسے واپس مل گئے تو ایک چکر اور لگا لوں گا۔''
''پھل کتنے دن میں آئے گا؟'' عبدالباسط کچھ بے چین لگ رہا تھا۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گی؟''
''اللہ نے چاہا تو سب خیریت سے آجائے گا۔'' عثمان احمد نے اسے تسلی دی۔ ''سب جان پہچان اور اعتماد والے لوگ ہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، پھل تین سے چار دن میں آجائے گا۔''
''اتنی دیر میں......!'' عبدالباسط نے حیرت سے کہا۔
''ٹرک اتنا تیز نہیں چلتے اور پوری طرح لوڈ ٹرک تو بیس تیس میل سے اوپر جاتے ہی نہیں ہیں پھر ٹرک ڈرائیور کو آرام بھی چاہئے ہوتا ہے اس لئے وہ دیر سے ہی آتے ہیں لیکن اس کا بھی فائدہ ہے، گرمی سے آم بھی اچھی طرح پک جاتا ہے۔''
عبدالباسط مطمئن نظر آنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دو مہینے عبدالباسط اور اس کے خاندان کے لئے کامیابیوں سے بھرپور ثابت ہوئے تھے۔ اس نے جن آموں کی لاٹ اٹھائی تھی، وہ ایک مہینے کے اندر نکل گئی تھی۔ عبدالباسط کو مجموعی طور پر ساڑھے چھ لاکھ روپے ملے تھے یعنی اسے ڈھائی لاکھ کا نفع ہوا تھا۔ شیڈز مکمل ہو گئے تھے اور انہوں نے فوری طور پر کام شروع کر دیا تھا۔ عثمان احمد نے اتنا مال منگوایا تھا کہ اس کا گودام ناکافی پڑ گیا تھا اس لئے اس نے اپنے ہی شیڈز کرائے پر لے لئے تھے۔ کرائے پر دینے کی صورت میں ان سے ہزار بارہ سو روپے یومیہ کی آمدنی تھی، گویا اس میں عبدالباسط کا حصہ کم سے کم بارہ ہزار روپے ماہانہ بنتا تھا۔
رقم حاصل ہوتے ہی اس نے اس بار راحیل کو عثمان احمد کے ساتھ بھیجا تھا کیونکہ وہ خود شیڈز والے دفتر میں بیٹھتا تھا۔ اگست کے آخر تک اس نے اپنے دس لاکھ روپے تقریباً دگنے کر لئے تھے۔ اب وہ مختلف پھلوں کے ٹھیکے لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ٹھٹھہ اور اس کے نواح میں کیلا، آم، چیکو اور انناس بڑے پیمانے پر کاشت کیا جا رہا تھا۔ عبدالباسط، عثمان کے ساتھ مل کر ان پھلوں کا کاروبار کرنا چاہتا تھا۔
اگست کے آخر میں عبدالباسط نے کار لے لی۔ اس نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ مکان بھی خرید لے گا لیکن فی الوقت اپنے پاس موجود سرمایہ کاروبار میں لگانا چاہتا تھا۔ اس نے کئی بار اشاروں میں کہا کہ وہ اب اپنا کام الگ کرنا چاہتا ہے۔ اس نے منڈی میں دفتر کے لئے ایک جگہ بھی خرید لی تھی اور اس پر دفتر تعمیر کروا رہا تھا۔
دوسری طرف راحیل کسی اور فکر میں تھا۔ اسے اس کاروبار سے اتنی دلچسپی نہیں تھی جس میں ناک کو ہمہ وقت پھلوں اور سبزیوں کی ملی جلی ناخوشگوار بو کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز عثمان احمد کی بڑی بیٹی نوشابہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ اپنی پرکشش شخصیت کی مدد سے وہ اسے اپنی طرف متوجہ کر لے گا۔ اب اس کا عثمان احمد کے گھر بے تکلف آنا جانا تھا، اسد اور امجد کی بیویاں اور نوشابہ کی باقی تین بہنیں اس سے بے تکلف تھیں لیکن نوشابہ بس لئے دیئے رہنے والے انداز میں رہا کرتی تھی، اس کے سامنے کم ہی آتی اور آتی بھی تو صرف اپنے کام سے...... وہ پردہ نہیں کرتی تھی لیکن چادر یا بڑا سا دوپٹہ ضرور لیتی تھی۔ راحیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے اور اس سے بے تکلف ہونے کی کئی کوششیں کی تھیں لیکن اس کی یہ تمام کوششیں نوشابہ نے اپنی مخصوص ثابت قدمی سے ناکام بنا دی تھیں۔
اس روز نوشابہ کالج سے واپس آ رہی تھی کہ راستے میں بس خراب ہو گئی۔ اس زمانے میں گلشن معمار کے روٹ پر چند ایک بسیں ہی چلتی تھیں اور وہ بھی خاصی دیر کے بعد آتی تھیں۔ اس روز موسم بھی خراب تھا، آخر اگست کی کالی گھٹائیں جیسے برسنے پر تلی ہوئی تھیں۔ نوشابہ نے سوچا کہ اس سے پہلے بارش ہو جائے، اسے پیدل ہی اپنے گھر پہنچ جانا چاہئے۔ زیادہ فاصلہ بھی نہیں رہ گیا تھا، اگر بارش شروع ہو جاتی تو وہ پھنس کر رہ جاتی، ممکن تھا راستے میں کوئی اور بس یا رکشہ مل جاتا۔
وہ پیدل گھر کی طرف چل پڑی۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گئی تھی کہ بارش شروع ہو گئی، ایسی تیز جھڑی لگی کہ وہ ایک منٹ میں شرابور ہو گئی۔ سڑک کے کنارے چھدرے سے درخت لگے تھے، ان کے تلے پناہ لینا بیکار تھا، اس لئے بھیگ جانے کے باوجود وہ تن بہ تقدیر چلتی رہی۔ اچانک اسے اپنے پاس ہی تیز بریک کی آواز آئی۔ ایک بائیک رکی تھی۔ وہ چونک کر ہٹی۔
''آپ......؟'' راحیل نے ہیلمٹ اتارتے ہوئے کہا۔ ''اتنی بارش میں پیدل جا رہی ہیں؟''
''میری بس خراب ہو گئی تھی۔'' نوشابہ نے بھیگ جانے والی چادر درست طریقے سے لپیٹنے کی کوشش کی۔ اس کے کپڑے بدن سے چپکے جا رہے تھے اور اسے راحیل کے سامنے الجھن ہو رہی تھی۔
راحیل نے اسے پیشکش کی۔ ''آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔''
''میں چلی جاؤں گی۔'' اس نے کمزور لہجے میں کہا۔
''پلیز ضد مت کریں، آپ کب تک اس بارش میں اور اس حلیے کے ساتھ چلتی رہیں گی؟'' راحیل کے لہجے میں تیزی تھی۔ ''یہ تو خود کو تماشا بنانے والی بات ہے۔''
راحیل کی اس بات نے نوشابہ کو مجبور کر دیا تھا۔ وہ بادل نخواستہ اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی۔ اس نے کوشش کی کہ اس کے اور راحیل کے درمیان فاصلہ رہے لیکن اول تو بائیک کی نشست ویسے ہی چھوٹی تھی اور پھر یہ اس طرح ڈھلوان تھی کہ پیچھے بیٹھنے والا خود بخود آگے کی طرف پھسلتا تھا پھر بائیک کا عقبی اسٹینڈ ہی نہیں تھا۔ مجبوراً اسے راحیل کا شانہ پکڑنا پڑا۔ اس نے نارمل رفتار سے بائیک چلائی تھی لیکن اس وقت بارش نے راستہ اتنا خراب کر دیا تھا کہ بائیک کو بری طرح جھٹکے لگ رہے تھے۔ نوشابہ بار بار راحیل سے ٹکرا رہی تھی۔ اسے یہ سب بے حد ناگوار لگ رہا تھا۔ آخر اس نے جھنجلا کر کہا۔ ''آہستہ چلائیں پلیز!''
''آہستہ ہی چلا رہا ہوں۔'' راحیل نے جواب دیا۔ ''ورنہ میں اس رفتار سے بائیک نہیں چلاتا۔''
گلی کا کونا آتے ہی اس نے راحیل سے کہا۔ ''مجھے یہاں اتار دیں۔''
''کیا حرج ہے اگر میں آپ کو گیٹ کے عین سامنے اتار دوں۔'' اس نے بائیک روکے بغیر کہا۔ ''اگر میں نے اس موسم میں آپ کو لفٹ دے دی تو یہ اتنی معیوب بات نہیں ہے جسے گھر والوں سے چھپایا جائے۔''
نوشابہ ہونٹ کاٹ کر رہ گئی تھی۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ نوریہ یا ماریہ میں سے کسی نے دیکھ لیا تو اس کا خوب ریکارڈ لگائیں گی کیونکہ وہ گھر میں ان کے سامنے بار بار راحیل سے بیزاری ظاہر کر چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ راحیل اسے پسند کرتا ہے، اس نے کبھی کوئی چھچھوری یا اخلاق سے گری ہوئی حرکت نہیں کی تھی، اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ اسے ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ امی اور ابو اس کا رشتہ راحیل سے کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اس معاملے میں اس سے پوچھا گیا تو وہ صاف انکار کر دے گی۔
راحیل نوشابہ کو اس کے گیٹ پر اتار کر چلا گیا۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو اوپر ٹیرس میں کھڑی ماریہ اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جس بات سے وہ ڈر رہی تھی، وہ ہو کر رہی۔ ابھی وہ لباس بدل کر بال سکھا رہی تھی کہ ماریہ آدھمکی۔ وہ اور ماریہ ایک ہی کمرے میں رہا کرتے تھے، نوریہ اور مونا دوسرے کمرے میں...... ماریہ نے آتے ہی معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اچھا جی...... ابھی کہتی تھیں کہ اس شخص سے چڑ ہے اور خود......!''
''یہ اتفاق ہے۔'' اس نے تیز لہجے میں ماریہ کی بات کاٹی۔ ''بارش نہ ہو رہی ہوتی تو میں کبھی اس کے ساتھ آنا پسند نہ کرتی۔''
ساری بات سن کر بھی ماریہ اس کا مذاق اڑاتی رہی تھی۔ تنگ آکر اس نے کہہ دیا۔ ''تم جو چاہے سمجھو۔''
اس کے بعد ماریہ وقفے وقفے سے اسے راحیل کا نام لے کر چھیڑتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ جتنا چڑے گی، ماریہ اتنا ہی چھیڑے گی اس لئے وہ سن کر انجان بن جاتی تھی۔ ان ہی دنوں اس نے سنا کہ راحیل کے باپ نے اپنا الگ کام شروع کر دیا ہے اور اس نے عثمان احمد سے اپنی رقم واپس مانگ لی ہے۔
عثمان احمد نے دو لاکھ روپے تو اسی وقت ادا کر دیئے تھے۔ ایک لاکھ اس نے چند دن بعد دیئے۔ اب عبدالباسط نے اپنے دفتر میں بیٹھنا شروع کر دیا تھا اور عثمان احمد کو گودام کے ساتھ شیڈز پر بھی توجہ دینا پڑتی تھی۔ گودام اس کے لئے زیادہ اہم تھا اس لئے اس نے امجد کو شیڈز والا دفتر حوالے کر دیا۔ اسے عبدالباسط کے اس طرح ساتھ چھوڑ دینے سے دھچکا لگا تھا لیکن اس نے یہ سوچ کر برداشت کیا کہ اب وہ کاروبار کا پورا مالک تھا، سارا نفع اس کے پاس آ رہا تھا پھر وہ اس خاندان کے بارے میں کسی اور زاویے سے سوچ رہا تھا۔ بالآخر نیرہ نے اسے قائل کر لیا تھا کہ راحیل، نوشابہ کے لئے اچھا شوہر ثابت ہو سکتا تھا اور اس قسم کی رشتے داری کے لئے بہتر تھا کہ وہ کاروباری معاملات الگ کر لیں، ورنہ بعد میں کوئی بھی پیچیدگی پیدا ہوتی تو بیٹی پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ انہیں بھی راحیل پسند آیا تھا، اس نے پھل لانے کی ذمہ داری لے لی تھی، وہ مہینے میں دو تین بار اندرون سندھ جاتا تھا، فی الحال عبدالباسط کیلے اور انناس کی سپلائی کر رہا تھا۔
اس بستی میں اکثر لوگ نئے تھے اور ایک دوسرے کے خاندانی پس منظر سے لاعلم تھے۔ اس لئے فطری طور پر ان میں ایک دوسرے کے پس منظر کے بارے میں جاننے کا جذبہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو بس اس بات سے خوش ہوتے تھے کہ ان کے پڑوس میں ایک اچھا خاندان آکر آباد ہو گیا ہے۔ اس لئے عثمان احمد بھی عبدالباسط اور اس کے خاندان کے بارے میں اتنا فکرمند نہیں تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ اچھے لوگ تھے، ان کا رکھ رکھاؤ اور بات چیت کا انداز یہی ظاہر کرتا تھا۔ پڑوسیوں سے سلوک سے رہنے اور لینے دینے میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ صرف ان ہی سے نہیں بلکہ تقریباً سارے ہی محلے سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔
راحیل کی تعریف سارا محلہ کرتا تھا اور نیرہ نے بتایا کہ محلے کے اور کئی لڑکیوں والے گھرانے اس میں دلچسپی لے رہے تھے اور کیوں نہ لیتے خوش شکل تھا، ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا تھا پھر باپ کا اچھا خاصا کاروبار تھا، اس کا وارث بھی وہی ہوتا جو لڑکی ان کے ہاں آتی، اکیلے راج کرتی۔ ایسے لڑکے کو کون ناپسند کرتا۔
نیرہ فکرمند تھی کہ ان سے پہلے کوئی اور نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لے۔ ایک رات کھانے کے بعد عثمان احمد اور نیرہ چہل قدمی کے لئے نکلے تھے۔ شہر کے دوسرے علاقوں کے برعکس گلشن معمار میں ایسا ماحول تھا کہ لوگ رات گئے تک باہر گھومتے یا اپنے گھروں کے آگے بنے باغیچوں میں کرسیاں ڈال کر بیٹھے رہتے تھے۔ جب سے عثمان کو انجائنا کی ہلکی سی تکلیف ہوئی تھی، وہ خوراک اور ورزش پر خاص توجہ دینے لگا تھا، روزانہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد طویل چہل قدمی کرتا تھا۔
ہفتے میں تین بار صبح دو تین میل کی دوڑ لگاتا تھا۔ چہل قدمی کے دوران دونوں میاں، بیوی گھر کے مسائل پر بات کر لیا کرتے تھے جن میں بعض مسائل پر بچوں کے سامنے گفتگو کرنا ممکن نہ ہوتی تھی جیسے لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ......!
''کیا عبدالباسط کی بیوی نے کوئی بات کی ہے؟'' عثمان احمد نے پوچھا۔
''نہیں واضح بات تو نہیں کی ہے لیکن اشاروں میں کئی بار کہہ چکی ہیں، نوشابہ انہیں پہلی ملاقات میں پسند آئی تھی۔''
''اب تک انہوں نے کوئی واضح بات نہیں کی ہے اور تم رشتے کا سوچ رہی ہو؟'' عثمان احمد کے لہجے میں تعجب تھا۔
''آپ کو نہیں پتا ان معاملات کا!'' نیرہ بولی۔ ''اس قسم کی باتیں قبل از وقت کھل کر نہیں کی جاتی ہیں بس اشاروں کنایوں میں ہوتی ہیں، اگر آپ چاہیں تو میں خود ان سے بات کر لوں، ہم عورتوں میں ایسی باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتی ہیں بلکہ میں سوچ رہی ہوں کہ راشدہ آپا کا ذکر کروں، وہ کئی بار اپنے انور کے لئے مجھ سے کہہ چکی ہیں۔''
''انور......!'' عثمان احمد کے لہجے میں خفگی تھی۔ ''راشدہ آپا کو اپنے نکھٹو بیٹے کے لئے نوشابہ ہی نظر آئی ہے؟''
''افوہ......! اتنا خفا کیوں ہوتے ہیں۔'' نیرہ بولیں۔ ''رقیہ کو کیا معلوم کہ انور کیسا ہے اور ہم کبھی اس کو بیٹی دینے کا سوچ بھی نہیں سکتے، میں تو ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کہوں گی۔''
''دیکھ لو لیکن ابھی نوشابہ کی اتنی عمر نہیں ہوئی ہے کہ تم اس کا رشتہ تلاش کرنے کے لئے یہ حربے استعمال کرو۔''
''ہاں ابھی بیس سال کی ہے لیکن وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے اس کے بعد تین لڑکیاں اور بھی ہیں، ماشاء اللہ مونا نے اتنی سی عمر میں کیسا قد کاٹھ نکالا ہے، لوگ نوشابہ کو بڑی عمر کا سمجھنے لگیں گے، اس سے چھوٹی تین جوان ہو چکی ہیں۔''
''بھئی مرضی تمہاری!'' عثمان احمد نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ ''یہ تمہارا شعبہ ہے جیسے چاہو ہینڈل کرو۔''
نیرہ کھل گئی تھی۔ ''یعنی آپ کی اجازت ہے؟''
''ہاں......! لیکن دیکھ لینا ذات برادری کیا ہے، کس فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔''
''یہ سب دیکھ لوں گی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''راحیل مجھے اچھا لگا ہے اس لئے ذات برادری کی زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے...... ہاں فرقہ میں دیکھ لوں گی۔''
''ٹھیک ہے۔'' عثمان احمد نے بیوی کی تائید کی۔ ''ویسے بھی وہ اچھے خاندان سے لگتے ہیں۔''
اگلے روز سہ پہر کے وقت نیرہ ان کے ہاں گئی۔ اس وقت عبدالباسط اور راحیل دونوں ہی نہیں ہوتے تھے اس لئے وہ کھل کر رقیہ سے بات کر سکتی تھی۔ رقیہ نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا، اس کے لئے چائے بنا لائی۔ کچھ دیر پہلے ہی نیرہ نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا اس لئے ریفریشمنٹ کا منع کر دیا۔ چائے لے کر وہ مکان کے اگلے حصے میں سرو کے درختوں کے پاس رکھی لان چیئرز پر آ بیٹھے۔ نیرہ نے نوشابہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ ''میں چاہتی ہوں کہ اب اس کا رشتہ ہو جائے۔''
رقیہ خاتون کا ردعمل ذرا مایوس کن تھا۔ اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔ ''کیا نوشابہ کا کوئی رشتہ ہے؟''

(جاری ہے)

"ارے کوئی ایک رشتہ......!" نیرہ نے لہجے میں فخر سموتے ہوئے کہا۔

"ماشاءاللہ کئی لوگ متمنی ہیں، میرے ایک رشتے کی دیورانی راشدہ آپا تو اپنے بیٹے کے لئے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑی ہیں، میں سوچ رہی ہوں نوشابہ



کاشف زبیر

آخری قسط

کے فائنل کے امتحان نزدیک ہیں، اب اس کے لئے کوئی فیصلہ کرلوں۔"

رقیہ کے چہرے پر ہچکچاہٹ نظر آئی جیسے اس نے یکدم فیصلہ کرلیا۔ "میرے راحیل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

نیرہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "ارے آپ بھی...... آپ نے پہلے کیوں نہیں کہا؟"

"بات یہ ہے کہ مالی طور پر ہم آپ لوگوں کے ہم پلہ نہیں ہیں۔" رقیہ نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "ہمارا نہ اپنا مکان ہے اور نہ ہی اتنی آمدنی......! ابھی کاروبار کا آغاز ہے اس لئے بس گزارہ چل رہا ہے، ایسے میں مجھے راحیل کی بات کرتے ہوئے شرمندگی ہو رہی تھی۔"

"آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں، راحیل ماشاءاللہ ہزاروں میں ایک ہے، دولت ہمارے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتی لیکن بہن شادی کے لئے ایک دوسرے کے بارے میں جاننا نہایت ضروری ہوتا ہے اور ہمیں آپ کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"عبدالباسط کا گاؤں وادی نیلم میں ہے اور میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ پینسٹھ کی جنگ کے بعد مقبوضہ کشمیر سے آئی تھی، میرا پورا خاندان بھارتی فوج کی بربریت کا نشانہ بن گیا تھا، مظفرآباد کے ایک مہاجر کیمپ میں، میں جوان ہوئی، وہیں ماں نے آخری سانسیں لیں، میٹرک کرکے میں نے ٹیچر کی نوکری کرلی پھر وہیں میری ملاقات عبدالباسط سے ہوئی، وہ حکومت کی طرف سے کیمپ کے ذمے داروں سے ملنے آتے تھے، دو تین ملاقاتوں میں ہم نے شادی کا فیصلہ کرلیا، شادی کے بعد میں رخصت ہوکر اسلام آباد آگئی، وہیں راحیل پیدا ہوا، آنے والے انتیس برس میں نے وہیں سرکاری بنگلوں میں گزارے، پچھلے برس ہم کراچی آگئے، یہ ہے ہمارا کل پس منظر......!"

نیرہ سوچ رہی تھی کہ اس پس منظر میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ یہ بے حد سادہ اور آسان پس منظر ہے، اس میں تصدیق کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا۔ "بہن! میں اپنے شوہر سے بات کروں گی۔"

"ٹھیک ہے، پہلے آپ اپنے گھر میں بات کرلیں پھر میں راحیل کے ابو سے بات کروں گی، ورنہ اس معاملے کو ہم دونوں تک محدود رہنا چاہئے۔"

نیرہ نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

اس رات اس نے دوبارہ عثمان احمد سے بات کی اور اسے رقیہ سے ہونے والی گفتگو کی تفصیل بتائی۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بھئی پہلے لڑکوں اور ان کی بیویوں سے بھی مشورہ کرلو، اس کے بعد آرام سے بیٹھ کر فیصلہ کرلیں گے اور ہاں نوشابہ سے پوچھنا لازمی ہے کیونکہ زندگی اس نے گزارنی ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ انکار نہیں کرے گی۔" نیرہ نے پرخیال انداز میں کہا۔ "لیکن میں پھر بھی پوچھ لوں گی۔"

"بیٹی کا رشتہ اسی کی خوشی اور اس کی مرضی سے کرنا چاہئے۔" عثمان احمد نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

☆......☆......☆

اس روز نوشابہ کالج نہیں گئی تھی۔ اس نے ماں کے ساتھ کپڑوں کی خریداری کے لئے مارکیٹ جانا تھا۔ نیرہ ہفتے میں ایک بار مارکیٹ جاتی تھی ضرورت کا سامان لینے...... نوشابہ کو ڈرائیونگ آتی تھی، جس روز انہوں نے کہیں جانا ہوتا تھا، اسد اپنی کار چھوڑ جاتا تھا۔ نیرہ اس کے کمرے میں آئی تو وہ یہی سمجھی کہ ماں اسے مارکیٹ کے لئے تیار ہونے کا کہنے آئی ہے مگر نیرہ نے کچھ اور ہی بات کرنی تھی۔

"نوشابہ......! میں ایک خاص بات پوچھنے آئی ہوں...... یہاں بیٹھو۔"

اپنی الماری میں چیزیں ترتیب سے رکھتی نوشابہ آکر ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ "جی امی......!"

"دیکھو بیٹی! اب تم ماشاءاللہ بیس سال کی ہوچکی ہو، اس سال گریجویشن بھی مکمل کرلوگی، اب میں اور تمہارے ابو چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنے گھر کا کردیں۔"

"جی امی......!" نوشابہ کا سرخ ہوتا چہرہ جھک گیا۔

"سامنے والی رقیہ نے مجھے اپنے بیٹے راحیل کے لئے کہا ہے۔" نیرہ نے ذرا توقف کیا اور پھر پوچھا۔ "راحیل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

نیرہ کا خیال تھا کہ نوشابہ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے ہچکچائے گی یا شرمائے گی لیکن اس نے دھیمی مگر صاف آواز میں کہا۔ "امی! وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں......؟" نیرہ کو حیرانی ہوئی۔ "میں نے اس میں کوئی خرابی نہیں دیکھی، کیا اس نے تم سے بھی کچھ کہا؟"

"نہیں امی......! میری تو اس سے بات بھی نہیں ہوئی کبھی۔" نوشابہ نے جلدی سے کہا۔ "بس وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"اوہ......!" نیرہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی...... اگر تمہارے پاس کوئی واضح خامی نہیں ہے تو یہ محض احساسات کی بات ہے، شادی کے بعد وہ تمہیں اچھا لگنے لگے گا۔"

شادی کے ذکر پر نوشابہ کی گردن مزید جھک گئی۔ نیرہ سمجھی کہ وہ شرما رہی ہے۔ اس نے طویل سانس لیا۔ "چلو تیار ہوجاؤ، مارکیٹ جانا ہے، ہفتے بھر کا سامان لانا ہے۔"

"جی امی......!" نوشابہ نے سر ہلایا۔ وہ ویسے بھی ماں، باپ کی فرمانبردار اور موجودہ دور کی لڑکیوں کے مقابلے میں سیدھی سادی سی تھی۔ اسے ماں، باپ سے بحث کرنا پسند نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ ماں کو کھل کر نہیں بتا سکی تھی کہ راحیل اسے قطعاً پسند نہیں تھا۔ وہ اس کے لئے اتنا غیر اہم تھا کہ وہ اس کے بارے میں سوچنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ ماں سمجھ رہی تھی کہ اس کی ناپسندیدگی عام نوعیت کی تھی جبکہ وہ راحیل کو شریک حیات کے طور پر جیسے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے سوچا کہ ماں کو واضح لفظوں میں منع کرے لیکن کس طرح، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر رات کو جب وہ اور ماریہ کمرے میں سونے کی تیاری کر رہے تھے تو ماریہ نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔ "کیا بات ہے آپی! تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟"

تب نوشابہ کی سمجھ میں آیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اس نے ماریہ کو ماں اور اپنی صبح کی بات کے بارے میں بتایا۔ "ماریہ! کسی طرح امی تک یہ بات پہنچا دو کہ میں کسی صورت راحیل سے شادی نہیں کرسکتی، ایسا کرنے سے بہتر ہوگا میں مرجاؤں۔"

"خدا نہ کرے۔" ماریہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "آپی پریشان کیوں ہورہی ہو، کیا امی، ابو زبردستی تمہاری شادی کردیں گے اور ایک بات بتاؤ راحیل بھائی میں کیا خرابی ہے؟"

"کوئی خرابی نہیں۔" نوشابہ نے منہ بنایا۔ "بس وہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے اور میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ شخص وہ نہیں ہے جو اوپر سے نظر آتا ہے۔"

ماریہ ہنسی۔ "پھر کیا ہے...... اور اسے کیا نظر آنا چاہئے؟"

"میری بات کا یقین کرو، میں وضاحت نہیں کرسکتی، میں جب اسے دیکھتی ہوں مجھے لگتا ہے یہ اداکاری کررہا ہے۔"

"تب تم کیا چاہتی ہو؟"

"بس تم امی تک یہ بات پہنچا دو...... میں خود ان سے نہیں کہہ سکتی، میں راحیل سے کسی صورت شادی نہیں کرسکتی اس کے علاوہ امی، ابو جس سے چاہیں میرا رشتہ کردیں، میں اف نہیں کروں گی۔"

ماریہ نے اسے غور سے دیکھا۔ "تم اتنی سنجیدہ ہو......! اچھا میں امی سے بات کروں گی۔"

اگلے روز ماریہ نے موقع پاکر ماں سے بات کی اور ان کو نوشابہ کے فیصلے سے آگاہ کردیا۔ نیرہ حیران رہ گئی۔

"حیرت ہے آخر وہ اس کے خلاف کیوں ہے؟"

"پتا نہیں...... لیکن آپی کو راحیل بھائی شروع سے ہی اچھے نہیں لگے تھے۔" ماریہ نے صاف گوئی سے بتا دیا۔

"میں خود اس سے بات کرتی ہوں۔" نیرہ نے کہا اور خود نوشابہ کے کمرے میں جا پہنچی۔ وہ پڑھ رہی تھی۔

"جی امی! مجھے بلا لیا ہوتا۔" اس نے کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، بات مجھے کرنا تھی۔" نیرہ نے پیار سے اس کے پاس بیٹھ کر کہا۔ "ماریہ نے تمہاری بات مجھ تک پہنچا دی ہے، کیا یہ تمہارا قطعی فیصلہ ہے؟"

"جی امی......!" اس نے پھر کہا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "امی! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"

نیرہ نے اسے گلے لگا لیا۔ "ہرگز نہیں......! میں اپنی پیاری سی بیٹی سے کیوں ناراض ہونے لگی...... مجھے سب سے زیادہ تمہاری خوشی عزیز ہے اور فکر نہ کرو اب بھی اور آئندہ بھی تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا، ویسے تم یہ بات مجھ سے براہ راست بھی کہہ سکتی تھیں، میں ماں ہوں تمہاری...... تم مجھ سے ہر بات کہہ سکتی ہو۔"

"بس امی......! میں گھبرا رہی تھی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ نوشابہ کے سر سے جیسے بوجھ اتر گیا تھا۔

دو روز بعد نیرہ نے رقیہ سے کہہ دیا۔ "بہن! بچی راضی نہیں ہے، ابھی وہ آگے پڑھنا چاہتی ہے اس لئے فی الحال اس کے رشتے کی بات نہیں کرسکتے۔"

☆......☆......☆

راحیل کا چہرہ مارے طیش کے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے رقیہ کی طرف دیکھا۔ "مجھے نہیں پتا...... میں نے ہر صورت اس لڑکی سے شادی کرنا ہے۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" عبدالباسط نے اسے ڈانٹا۔ "دنیا میں لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں ہے اور ویسے بھی یہ لوگ ہوشیار ہیں، ہمیں کوئی اور گھر دیکھنا ہوگا۔"

راحیل نے سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔ "بس اب یہ سب نہیں ہوگا، میں تنگ آگیا ہوں اس زندگی سے...... جرم اور بھاگنے سے......! کیا میں ساری عمر اس طرح بھاگتا رہوں گا؟"

عبدالباسط نے طنزیہ لہجہ اختیار کیا۔ "یہ تم نہیں تمہارے پیٹ میں پڑی روٹیاں بول رہی ہیں، بھول گئے وہ وقت جب دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے تھے۔"

راحیل نے گہری سانس لی۔ "اس زندگی میں سکون تھا، یوں بھاگ دوڑ اور ضمیر کی خلش تو نہیں تھی، میرا حصہ مجھے دے دو، اب میں مزید یہ کام نہیں کرسکتا۔"

"کیسا حصہ......؟" عبدالباسط نے سکون سے پوچھا تھا۔

"اب تک ہم نے تقریباً پینتیس لاکھ روپے کمائے ہیں۔" راحیل نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "تمہاری بیوی اور تمہارا حصہ ساٹھ فیصد ہے، اس طرح میرا حصہ چالیس فیصد جو چودہ لاکھ روپے بنتا ہے۔"

عبدالباسط مسکرانے لگا۔ "یاد ہے نا ہم نے کیا طے کیا تھا، ایک کروڑ روپے کا...... اس سے پہلے تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ابھی ہمارا ٹارگٹ ادھورا ہے۔"

"جہنم میں گیا ٹارگٹ!" راحیل غرایا۔ "میں اس کام میں اب مزید شریک نہیں ہوسکتا، میں پہلے ہی دوبار اپنی غیرت قربان کرچکا ہوں۔"

"اس کے بدلے تم ایک پرآسائش زندگی گزار رہے ہو۔" عبدالباسط کے لہجے میں حقارت تھی۔ "جو چیز تمہارے پاس تھی ہی نہیں، تم اسے قربان کیسے کرسکتے ہو، یاد ہے نا تم گندی نالی کے کیڑے تھے، تمہیں دو وقت کی روٹی میسر نہ تھی، اب تم ایک باعزت مقام پر ہو۔"

"خبیث بڈھے......!" راحیل پھٹ پڑا۔ "تم اسے باعزت مقام کہتے ہو، جس دن پولیس کا ہاتھ ہم تک پہنچ گیا، اس دن عزت کے سارے مفہوم سمجھ جاؤ گے، خیریت اسی میں ہے میرا حصہ مجھے دے دو اور نوشابہ سے میری شادی کراؤ ورنہ......!"

"ورنہ کیا کرلوگے؟" عبدالباسط کے لہجے میں اطمینان تھا۔

"میں تمہیں قتل کردوں گا۔" راحیل نے یکدم اپنے لباس سے ایک عدد چھوٹا سا ریوالور نکال لیا۔

"پھر وہ رقم کیسے حاصل کروگے جو صرف مجھے معلوم ہے کہ کہاں ہے؟" عبدالباسط ہنسا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" رقیہ نے تیزی سے دونوں کے درمیان آتے ہوئے کہا۔ "اب تک تو ٹھیک تھے، اب کیا ہوگیا؟"

"مجھ سے کیا کہہ رہی ہو، اس سے پوچھو...... اس لڑکی کے چکر میں پڑ کر یہ خود بھی جیل جائے گا اور ہمیں بھی پھنسوائے گا شاید اسے خوش فہمی ہے کہ نوشابہ سے شادی کرکے سکون سے زندگی گزار سکے گا جبکہ پولیس ہماری تلاش میں ہے۔"

"اگر ایسا ہوتا تو اب تک ہم پھنس چکے ہوتے۔" راحیل نے گویا خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس نے ریوالور دوبارہ جیب میں رکھ لیا تھا۔ "قدرت نے ہمیں موقع دیا ہے پرسکون اور شریفانہ زندگی گزارنے کا...... ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے، ہم مکان خرید سکتے ہیں، کاروبار کر رہے ہیں، ہم ایک خاندان بن کر رہ سکتے ہیں۔"

"ایک خاندان......!" عبدالباسط استہزائیہ انداز میں بولا۔ "برخوردار! ہمیں یہاں نہیں رہنا، یہاں کسی نہ کسی دن پولیس کا ہاتھ ہم تک آجائے گا، بے شک کراچی بڑا شہر ہے لیکن جس دن کوئی پرانی جان پہچان والا نکل آیا، وہی ہماری آزادی کا آخری دن ہوگا اور دوسرے تم ایک بات بھول رہے ہو نوشابہ انکار کرچکی ہے، اس کے گھر والے اس کی خوشی میں راضی ہیں، پھر تم کیسے اس سے شادی کروگے...... میں کہتا ہوں ہمیں وقت ضائع کئے بغیر نیا شکار تلاش کرنا چاہئے، ہر گزرتے دن ہمارے لئے خطرات بڑھ رہے ہیں۔"

"مجھے تو کوئی خطرہ نظر نہیں آرہا ہے۔" راحیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیوں نہیں کہتے کہ پرسکون اور شریفانہ زندگی میں تمہیں اپنی ہوس پوری کرنے کا موقع کب ملے گا۔"

عبدالباسط کا چہرہ اس پوری گفتگو کے دوران پہلی بار سرخ ہوا تھا۔ اس نے غضب ناک نظروں سے راحیل کی طرف دیکھا۔ "لگتا ہے تم واپس اس گندی نالی میں جانا چاہتے ہو۔"

"کیا تم میں اتنی ہمت ہے؟" راحیل نے اسے چیلنج کرنے والی نظروں سے دیکھا۔

عبدالباسط خاموش ہوکر ہونٹ چبانے لگا پھر اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "ایک اور واردات کریں گے اس کے بعد ہم اپنا حصہ الگ کرکے اپنی اپنی راہ لیں گے۔"

راحیل اسے نفرت سے سلگتی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسے احساس تھا کہ وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ سب کچھ اس کے قبضے میں تھا، اگر وہ چاہتا تو اسے ایک کوڑی بھی نہ دیتا۔ راحیل اسے مار کر بھی کچھ حاصل نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے خود کو صبر کی تلقین کی۔ عبدالباسط کی اس بات میں وزن تھا کہ نوشابہ اسے کسی صورت حاصل نہیں ہوسکتی اس کے باوجود وہ اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ پہلی لڑکی تھی جو اسے پسند آئی تھی ورنہ عورت ذات اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ غور کرنے لگا کہ کس طرح سے نوشابہ کو ہمیشہ کے لئے حاصل کرسکتا ہے۔ اسے غوروفکر میں ڈوبا دیکھ کر عبدالباسط اور رقیہ کچھ تشویش زدہ نظر آنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

"سر! ایسا کریں کہ ان لوگوں کی تصویریں اخبار میں شائع کرادیں۔" شبیر احمد نے تجویز پیش کی۔

"اس صورت میں وہ لوگ فرار ہونے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کریں گے۔" محمود علی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کامیابی کے اتنے نزدیک آکر کوئی حماقت نہیں کی جاسکتی۔"

انہوں نے اپنے ذرائع سے ان لوگوں کا پتا چلانے کی کوشش کی تھی، خاص طور سے اسٹیٹ ایجنٹس سے رابطہ کیا تھا لیکن کسی نے بھی نذر حسین یا عباس حسین کی تصاویر شناخت نہیں کیں۔ اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ انہوں نے مکان کسی اور طریقے سے حاصل کیا تھا۔ اسٹیٹ ایجنٹ کو درمیان میں لائے بغیر اس وجہ سے وہ ان کے لئے ناقابل شناخت تھے۔

اکتوبر کا دوسرا ہفتہ چل رہا تھا اور اب تک ان کی تفتیش کی گاڑی وہیں رکی تھی جہاں تک کالو کمرانی نے رہنمائی کی تھی۔ شبیر احمد کسی قدر مایوس تھا لیکن محمود علی پرامید تھا کہ اب کامیابی زیادہ دور نہیں ہے۔ گلشن معمار کوئی چھوٹا علاقہ نہیں تھا لیکن یہاں ابھی آبادی زیادہ نہیں ہوئی تھی، اگر وہ محنت کرتے تو ان تک پہنچ سکتے تھے۔ اب سارا مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح مجرموں کو احساس دلائے بغیر ان تک رسائی حاصل کی جائے۔

محمود علی ایسا کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا کہ مجرم ہوشیار ہوکر فرار ہوجائیں۔

"ہم ہر محلے میں جاکر ان کی تصاویر دکھا کر لوگوں سے پوچھ سکتے ہیں۔" شبیر نے ایک اور تجویز پیش کی۔

"اس میں بھی وہی خرابی ہے، بات پھیلے گی اور ہم سے پہلے مجرموں تک پہنچ گئی تو وہ فرار ہوجائیں گے۔" محمود علی نے پھر تجویز مسترد کردی۔

"تب آپ بتائیں کہ کیا کیا جاسکتا ہے؟" شبیر احمد نے پوچھا۔

"یار! اتنے مایوس کیوں ہو رہے ہو؟" محمود علی مسکرایا۔ "دیکھو ہمیں ان کو اس طرح تلاش کرنا ہے کہ اس کام میں کم سے کم افراد ملوث ہوں اور جو ہوں، ان پر ہمارا کنٹرول ہو، ورنہ بات مجرموں تک چلی جائے گی، اب ذرا غور کرو ایسے کتنے افراد ہوسکتے ہیں جو علاقے کے اکثر لوگوں سے واقف ہوں۔"

شبیر احمد کے تربیت یافتہ ذہن نے فوراً اس گائیڈ لائن پر کام کرنا شروع کردیا۔ "ایک تو ہاکرز ہوسکتے ہیں۔"

"ہاں...... لیکن ان کا کام صبح سویرے کا ہوتا ہے اور ان کا لوگوں سے سامنا بھی کم ہی ہوتا ہے، وہ بس اخبار پھینک کر چلے جاتے ہیں۔"

"اخبار کا بل لینے والا شخص!" شبیر نے تجویز کیا۔ "وہ تو ہر گھر میں جاتا ہے اور اہل خانہ سے بات کرتا ہے۔"

"یہ کی نا کام کی بات!" محمود علی نے خوش ہوکر کہا۔

اس وقت وہ دونوں سپر ہائی وے کے ساتھ ایک جھگی ہوٹل میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ گزشتہ ایک ہفتے سے وہ مسلسل گلشن معمار کا چکر لگا رہے تھے۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا اس لئے انہوں نے جھگی ہوٹل سے اٹھ کر سپر ہائی وے کے ساتھ واقع ایک اچھے ریسٹوران کا رخ کیا۔

☆......☆......☆

راحیل نے دو تین بار کوشش کی کہ نوشابہ سے ملاقات کرکے انکار کی وجہ پوچھے لیکن اسے موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس نے اپنے نام نہاد ماں، باپ کی وارننگ بھی نظرانداز کردی تھی کہ وہ نوشابہ کو فراموش کردے۔ راحیل بنیادی طور پر ایک بازیگر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، بچپن سے اس کے ماں، باپ اسے سرکس میں لے جانے لگے تھے جہاں اس نے قسم قسم کے کرتب سیکھے تھے، خوبصورت تھا اس لئے نوعمری میں اسٹیج پر زنانہ کرداروں میں کام کرنے لگا، اسے اداکاری اور رقص میں مہارت تھی، سرکس کے ایک شخص سے اس نے پڑھنا لکھنا اور اونچے طبقے کی بول چال سیکھی تھی۔ ماں، باپ کے مرنے کے بعد وہ اسٹیج سے منسلک ہوگیا لیکن کبھی دوسرے درجے کے فنکار سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا، پھر اس کی ملاقات عبدالباسط سے ہوئی۔ اس نے اسے اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی تھی۔ اسے کیا چاہئے تھا، اس گھٹیا ماحول سے نکلنے کا موقع مل رہا تھا، اس کے ساتھ وہ تین سال سے تھا، یہ عرصہ اس نے خوب عیش وآرام سے گزارا تھا۔ اگرچہ عبدالباسط کے بنائے ڈراموں کا مرکزی کردار وہ ادا کرتا تھا لیکن اس کی اداکاری سے زیادہ پلاٹ کا کمال ہوتا تھا کہ وہ ہر بار کامیاب رہے تھے۔ راحیل اسے دل میں تسلیم کرتا تھا لیکن ظاہر یوں کرتا تھا جیسے یہ سب اس کی محنت کا نتیجہ ہو۔

نوشابہ اب اس کی ضد بن گئی تھی۔ بنیادی طور پر وہ چھوٹے ذہن کا مالک تھا، کسی بڑے مقصد کے لئے اپنی خواہش کی قربانی نہیں دے سکتا تھا۔ اگر کوئی چیز درست طریقے سے حاصل نہیں ہوسکتی تھی تو وہ اسے غلط طریقے سے حاصل کرنے کا تہیہ کرلیا کرتا تھا۔

اب وہ نوشابہ کے معمولات پر نظر رکھنے لگا تھا۔ شادی والے معاملے سے انکار کے بعد اس نے عثمان احمد کے ہاں آنا جانا کم کردیا تھا لیکن اب ایک منصوبے کے تحت وہ روز ہی جانے لگا۔ اسے موقع کی تلاش تھی اور پھر جیسے اسے موقع مل گیا۔ اسد نے اسے بتایا کہ ان کی کزن کی حیدرآباد میں شادی تھی اور وہ سب حیدرآباد جارہے تھے۔

"سب گھر والے......؟" راحیل نے انجان بن کر پوچھا۔

"نہیں...... ابو اور نوشابہ نہیں جارہے ہیں، اس کے پیپرز ہیں، وہ تیاری کرے گی اور ابو اس کی وجہ سے نہیں جارہے ہیں، ہم دو دن میں آجائیں گے۔"

یہ سنتے ہی راحیل کے مجرمانہ ذہن میں ایک پلاٹ تشکیل پانے لگا۔ اس نے کرید کرید کر اسد سے سوال کئے کہ وہ کس وقت جائیں گے اور واپسی کب ہوگی؟ کیا عثمان احمد اس دوران دفتر جائے گا۔ اسد نے بتایا کہ وہ 15 / اکتوبر کی صبح نکلیں گے اور 17 / اکتوبر کی دوپہر تک واپس آجائیں گے۔ عثمان احمد دفتر سے چھٹی کرے گا، اگر کوئی ضرورت پڑی تو وہ ایک آدھ گھنٹے کے لئے دفتر کا چکر لگالے گا۔ 15 / اکتوبر دو دن بعد تھی۔ گویا اس کے پاس دو دن کا وقت تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ پہلے دن ہی کوشش کرے گا۔

15 / اکتوبر کی صبح وہ حسب معمول باسط کے دفتر چلا گیا۔ حال ہی میں کیلے کی ایک کھیپ آئی تھی، اسے منڈیوں تک پہنچانے کا کام جاری تھا۔ باسط بہت مصروف تھا، دفتر آکر اس نے 12 / بجے تک انتظار کیا اس کے بعد خاموشی سے نکلا۔ جن دنوں باسط، عثمان کے ساتھ کام کر رہا تھا، اس نے اس کو اپنے گودام کی ایک چابی دے دی تھی، باسط نے اس کی نقل بنوائی، بعد میں عثمان احمد نے چابی اس سے واپس لے لی تھی، راحیل نے باسط سے مذکورہ چابی کی نقل لے لی تھی۔

وہ دوپہر کے وقت دفتر سے نکلا۔ اسے معلوم تھا کہ گودام کا چوکیدار اور دوسرے لوگ نماز پڑھنے مسجد جاتے تھے اور اس وقت گودام خالی ہوتا تھا۔ وہ وہاں پہنچا تو حسب توقع گودام پر کوئی نہیں تھا، اس نے چھوٹا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا، اس نے جیب سے بوتل نکالی اور اس میں موجود پیٹرول وہاں رکھی لکڑی کی خالی پیٹیوں پر چھڑکنے لگا، بوتل خالی کر کے اس نے ایک طرف اچھال دی پھر جیب سے ماچس نکالی اور ذرا دور جا کر تیلی جلا کر پیٹیوں کی طرف اچھال دی۔

بھک کی آواز کے ساتھ پیٹرول نے آگ پکڑ لی۔ وہ پھرتی سے باہر نکلا اور دروازہ بند کر کے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

دفتر میں آکر اس نے باسط سے کہا۔ ”میری طبیعت خراب ہو رہی ہے، میں گھر جا رہا ہوں۔“

”میں بھی چلتا ہوں۔“ باسط نے کہا۔ ”آج کا کام ختم ہو چکا ہے۔“

”تم آتے رہنا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا اور رخصت ہوگیا۔

گھر میں آتے ہی اس نے چھت کا رخ کیا۔ وہاں ایک کھلا کمرہ تھا جہاں سے اردگرد کا منظر بآسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھ کر عثمان احمد کے گھر پر نظر جمادی۔ اس دوران باسط بھی آگیا تھا۔ اس کے آنے کے چند لمحے بعد راحیل نے عثمان احمد کو افراتفری کے عالم میں اپنی جیپ پر بیٹھ کر جاتے دیکھا۔ نوشابہ دروازہ بند کرنے آئی تھی اور اس کی صورت پر پریشانی راحیل یہاں سے دیکھ سکتا تھا۔ باپ کے جانے کے بعد وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

وہ دس پندرہ منٹ خاموش بیٹھا رہا پھر اتر کر نیچے آیا۔ باسط اور اس کی بیوی اپنے کمرے میں تھے، اس نے خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر ایک تھیلی اٹھائی، اسے اپنی قمیص کی جیب میں رکھا اور باہر نکل گیا۔

دوپہر کا وقت ہونے کی وجہ سے پوری گلی سنسان پڑی تھی۔ اس نے سڑک عبور کی اور عثمان احمد کے گھر کی کال بیل بجائی۔ اسے توقع تھی کہ نوشابہ گھر میں اکیلی ہوگی۔ حسب توقع دروازے پر نوشابہ آئی، اس نے دروازہ کھول کر سوالیہ نظروں سے راحیل کی طرف دیکھا۔

”مجھے ایک فون کرنا تھا، گھر کا فون خراب پڑا ہے۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

”وہ...... گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔“ نوشابہ گھبرا گئی تھی۔

”پلیز میں ایک منٹ سے زیادہ بات نہیں کروں گا۔“ اس نے عاجزی سے کہا۔ ”جمعے کی وجہ سے پی سی او بھی بند پڑے ہیں ورنہ میں وہاں چلا جاتا۔“

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ نوشابہ نے اسے اندر آنے کے لئے راستہ دے دیا۔ ”پلیز جلدی کیجئے گا، ہو سکتا ہے ابو کا فون آئے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ اس نے اندر آکر کہا۔ نوشابہ دروازہ بند کر کے اسے اندر لاؤنج میں لے آئی۔ راحیل اب تک اس کے ساتھ شریفانہ انداز میں پیش آتا رہا تھا اس لئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کسی غلط ارادے سے آیا ہے۔ لاؤنج میں آتے ہی راحیل نے جیب میں رکھا پیک ٹشو نکالا، پیک کھول کر ٹشو نکالتے ہوئے اس نے کہا۔ ”کتنی گرمی ہے آج...... اوہ یہ کیا ہے؟“

اس نے نوشابہ کے عقب میں دیکھا۔ وہ چونک کر پلٹی ہی تھی کہ راحیل نے جھپٹ کر ٹشو عقب سے اس کے منہ پر رکھ دیا، وہ مچلی مگر راحیل کی گرفت اتنی کمزور نہیں تھی کہ وہ خود کو چھڑا سکتی، پھر ٹشو میں بسے کلوروفام نے لمحوں میں اس کے ہوش و حواس کو مختل کر دیا تھا۔

وہ بے ہوش ہو کر گرنے لگی تو راحیل نے اسے بازوؤں میں اٹھایا اور اس کے بیڈ روم میں لے آیا۔ بستر پر ڈالتے ہوئے اس کے دل میں بے ایمانی آئی لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ وقت کم تھا اور اسے ابھی خاصا کام کرنا تھا۔ اس نے جیب میں رکھی تھیلی نکال لی تھی۔

☆......☆......☆

محمود علی اور شبیر احمد اخبار کی ایجنسی کے مالک سے ملے۔ عبدالغنی اس بستی میں سب سے بڑی اخبار و رسائل کی ایجنسی چلا رہا تھا۔ جب محمود نے اپنا تعارف کرایا اور آنے کا مقصد بیان کیا تو وہ خوشی سے راضی ہوگیا اور بولا۔ ”آپ کی مدد ہمارا فرض ہے جناب!“

”ہمیں ان دو افراد کی تلاش ہے۔“ محمود علی نے تصویریں اس کے سامنے رکھ دیں۔ ”یہ لوگ حال ہی میں یہاں آئے ہیں اور ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔“

عبدالغنی نے بغور تصاویر دیکھیں پھر چونکا۔ ”صاحب! میں یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اس داڑھی والے بوڑھے کی صورت عبدالباسط سے ملتی ہے۔“

محمود علی پرجوش ہوگیا تھا۔ ”یہ عبدالباسط کون ہے؟“

”یہ شخص کوئی سات مہینے پہلے یہاں آیا ہے اور اب مجھے یاد آرہا ہے اس کے بیٹے کی صورت اس لڑکے سے ملتی ہے، مجھے یقین ہے آپ کے مطلوبہ لوگ یہی ہیں، آئیں میں آپ کو ان کا گھر دکھاتا ہوں۔“

بالآخر دو مہینے کی تگ و دو کے بعد وہ مجرموں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ عبدالغنی انہیں گھر دکھانے کے لئے لایا۔ اس نے گلی کے کونے پر کھڑے ہو کر اشارہ کیا۔ ”وہ رہا جناب دائیں طرف کا دوسرا بڑا سا سیاہ گیٹ۔“

”تمہارا شکریہ، اب تم جا سکتے ہو۔“ محمود علی نے کہا اور پھر شبیر سے بولا۔ ”تم جا کر تھانے سے تین چار آدمی لے آؤ۔“

شبیر احمد سر ہلا کر روانہ ہوگیا۔ محمود علی گلی کے کونے پر کھڑا رہا۔ وہ پوری طرح مستعد تھا، اس کی نظریں سیاہ گیٹ پر مرکوز تھیں۔ ابھی شبیر احمد کو گئے کچھ دیر گزری تھی کہ سیاہ گیٹ کے سامنے ایک چھوٹی کار رکی، اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص بلاشبہ نذر حسین یا عبدالباسط تھا۔ محمود علی کو اسے شناخت کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ وہ کار سمیت اندر چلا گیا، اس کے جانے کے چند منٹ بعد سامنے والے بنگلے سے ایک سفید جیپ نکل کر تیزی سے روانہ ہوگئی۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سیاہ گیٹ سے ایک نوجوان نکل کر اس بنگلے کی طرف گیا جس سے ابھی سفید جیپ نکلی تھی۔

محمود علی کو اس بار بھی شناخت میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ یہ وہ نوجوان تھا جو اس سارے کھیل میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا یعنی عباس اور عرف راحیل...... محمود علی کو یقین تھا کہ ان میں سے کوئی بھی نام حقیقی نہیں تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ شبیر کو گئے نصف گھنٹہ ہونے کو آیا تھا، اب تک اسے آجانا چاہئے تھا۔ ابھی وہ جھنجھلا رہا تھا کہ پولیس موبائل خاموشی سے گلی میں داخل ہوئی اور اس میں سے کئی سپاہی کود کر گلی کی طرف جانے لگے۔

محمود علی نے شبیر کو اشارہ کیا کہ ایک دو سپاہی عقبی سمت بھیج دے۔ یہاں مکانوں کی پشتیں آپس میں ملی تھیں لیکن عین ممکن تھا اس مکان کے عقب میں خالی پلاٹ ہوتا اور گھر میں موجود افراد اس طرف سے فرار ہوجاتے۔

جب سپاہیوں نے گلی کی دونوں طرف ناکہ بندی کر دی تو وہ شبیر کے ساتھ عبدالباسط کے مکان کی طرف بڑھا۔ اس نے موبائل کے ساتھ آنے والے مقامی تھانے کے اے ایس آئی کو سامنے والے بنگلے کی نگرانی کا حکم دیا۔ ”ایک شخص اس میں گیا ہے، وہ بھی مطلوب ہے، سبز شرٹ اور ہلکی سبز پتلون میں ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ اے ایس آئی نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”اس مکان سے کوئی نکل کر نہیں جا سکے گا۔“

اب تک کی ساری کارروائی قطعی خاموشی سے ہوئی تھی اس لئے کسی کو خبر نہیں ہوئی تھی۔

شبیر احمد نے بیل دی۔ کچھ دیر بعد اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

”کوریئر والا جناب! ایک پارسل آیا ہے۔“ محمود علی نے جواب دیا۔ وہ سادہ لباس میں تھا اس لئے یہ خطرہ نہیں تھا کہ عورت اسے دیکھ کر ”پولیس پولیس“ کا شور مچاتی۔

عورت نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہ دھکا دے کر اندر گھس گیا۔ عورت نے چلانے کے لئے منہ کھولا تھا کہ محمود علی نے اس کا گلا دبوچ لیا۔ ممکن ہے کوئی اور عورت ہوتی تو وہ اتنی بے رحمی نہ دکھاتا لیکن وہ اس کو بھی پہچان گیا تھا۔ یہ اس شیطانی تکون کا ایک حصہ تھی جو اب تک کم سے کم دو لڑکیوں اور ان کے خاندانوں کو تباہ کر چکا تھا۔

”باقی دو کہاں ہیں؟“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”آواز نہ نکلے۔“

عورت نے آنکھوں سے اندر کی طرف اشارہ کیا۔ محمود علی نے سپاہیوں کو وہاں موجود ہر فرد کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔

وہ اندر گھس گئے۔ محمود علی نے عورت کے گلے پر گرفت نرم کی۔

”تم لوگوں کے ساتھ جو نوجوان ہے، وہ سامنے والے مکان میں گیا ہے، کیوں؟“

”مم...... مجھے...... نن...... نہیں ما...... لوم......!“ عورت نے بمشکل کہا۔

ذرا دیر میں اندر جانے والے سپاہی عبدالباسط کو ہتھکڑی پہنا کر لے آئے۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا، اسے دیکھ کر محمود علی نے خود پر قابو رکھا اور اسے نگرانی میں رکھنے کا کہہ کر وہ باہر آیا۔

سامنے والے بنگلے کی نگرانی کرنے والے اے ایس آئی نے بتایا کہ ابھی تک کوئی بنگلے سے باہر نہیں آیا ہے۔ اس دوران اردگرد کے رہنے والوں کو پولیس کے چھاپے کا علم ہوگیا تھا، دروازوں اور کھڑکیوں سے لوگ جھانک رہے تھے۔ محمود علی نے محسوس کیا کہ اگر راحیل ہوشیار ہوگیا تو بھاگ بھی سکتا ہے۔

”عقبی طرف کسی کو بھیجا ہے؟“ اس نے اے ایس آئی سے پوچھا۔

”جی...... ! دو سپاہی ادھر بھی ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

محمود علی نے مطمئن ہو کر دروازے کے ساتھ لگی کال بیل بجائی۔ پھر انتظار کرنے لگا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا جبکہ اندر یقینی طور پر کوئی تھا۔

دو منٹ تک جواب نہ ملنے پر اس نے شبیر احمد کو اشارہ کیا۔ دونوں گیٹ سے بیک وقت اندر کودے، سامنے سے برآمدے کے ستون کے عقب سے فائر ہوا لیکن عجلت میں نشانہ درست نہیں تھا۔ محمود علی اور شبیر احمد لڑھک کر محفوظ طرف چلے گئے۔

اس دوران محمود نے ستون کی طرف پے در پے فائر کئے تھے۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور راحیل تڑپ کر سامنے گرا، اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ گیا تھا، وہ اپنے گلے سے خون کے ابلتے والے فوارے کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ محمود علی نے اسے ڈرانے کے لئے فائر کیا تھا مگر اس کی شاید قضا آگئی تھی، گولی اس کی گردن کے پار ہوگئی تھی۔

محمود علی نے شبیر سے اسے دیکھنے کو کہا اور اندر کی طرف بڑھا۔

اندر اسے زیادہ تر کمرے خالی ملے تھے پھر ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ سامنے بیڈ پر ایک لڑکی نیم عریاں حالت میں پڑی تھی اور بظاہر بے ہوش لگ رہی تھی۔ اسی اثناء میں شبیر احمد بھی وہاں آگیا۔ ”وہ مرگیا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ پھر لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ کیا چکر ہے؟“

محمود علی نے کمرے کا جائزہ لیا اور بستر کے پاس میز پر ایک چھوٹا ڈیجیٹل کیمرہ دیکھ کر چونکا۔

”لگ تو ایسا رہا ہے جیسے یہ خبیث اسی لڑکی کی تصاویر لینا چاہتا تھا۔“

”لڑکی بے ہوش ہے۔“ شبیر احمد نے کہا۔

”اور اس سے پہلے ہوش میں آئے، اس کا حلیہ درست کر دینا چاہئے۔“

محمود علی نے لڑکی کا لباس درست کیا اور ڈیجیٹل کیمرہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس دوران اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس معاملے کو سرے سے گول کر دے گا۔ کہانی یہ ہوگی کہ پولیس ریڈ کے آثار دیکھ کر راحیل سامنے والے گھر میں جا گھسا اور لڑکی کو بے ہوش کر کے یرغمال بنا لیا اور جب پولیس نے بنگلے پر ریڈ کیا تو مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔ محمود علی کو اندازہ تھا کہ اگر لڑکی یا اس کے گھر والوں پر راحیل کی اصل نیت کھل گئی تو ان کی ساری عمر ایک خلش میں گزرے گی۔

باہر شبیر نے راحیل کی لاش اٹھانے کے لئے ایمبولینس بلوائی تھی۔ بیس منٹ میں ایمبولینس اور ڈاکٹر آگیا تھا۔ اس نے لڑکی کو بھی دیکھا اور اسے انجکشن دے کر ہوش میں لے آیا۔ ہوش میں آکر نوشابہ پہلے تو اتنے سارے اجنبی لوگوں کو دیکھ کر سہم گئی پھر جب اسے پتا چلا کہ راحیل مارا گیا ہے اور اس کی عصمت محفوظ ہے تو وہ مارے خوشی کے رو دی تھی۔ کچھ دیر بعد عثمان احمد بھی واپس گھر میں آگیا تھا۔

اس سنسنی خیز دن کا خاتمہ اسپیشل برانچ کے حوالات میں ہوا۔ عبدالباسط اور رقیہ کو الگ الگ رکھا گیا تھا۔ محمود علی نے دو سابقہ کیسوں میں ان کی گرفتاری دکھاتے ہوئے نئی ایف آئی آر بھی کاٹ دی تھی۔ اب اس کی کوشش تھی کہ کیس کسی پہلو سے بھی کمزور نہ رہے جس سے فائدہ اٹھا کر ملزمان قرار واقعی سزا سے بچ سکیں۔

وہ بے حد تھک گیا تھا۔ یہ ساری کارروائی محنت طلب تھی اس کے باوجود اس نے واپس گھر جا کر آرام کرنے کے بجائے پہلے عبدالباسط سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب اسے ملاقات کے کمرے میں لایا گیا تو وہ خود پر قابو پا چکا تھا اور پرسکون تھا۔

محمود علی نے اس کے کرتوتوں پر مبنی فائل اس کے سامنے رکھ دی اور بعض رپورٹس بھی پڑھ کر سنائیں۔

”کیا یہ سب سچ ہے شفیع الرحمٰن عرف نذر حسین عرف عبدالباسط......!“

وہ مسکرایا۔ ”ہاں یہ سب سچ ہے لیکن عدالت میں تم اسے ثابت نہیں کر سکتے۔“ خلاف توقع اس نے آسانی سے اقرار کر لیا تھا۔

”اس فکر میں نہ رہنا، میں عام پولیس افسران کی طرح کیس بھگتاتا نہیں ہوں، ایسی بات ہوتی تو میں تم تک پہنچ ہی نہ پاتا اس لئے خوش فہمی میں مت رہو، تمہاری بچت اس میں ہے کہ پولیس کے ساتھ تعاون کرو۔“

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ عبدالباسط نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

”سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ ان تین وارداتوں کے علاوہ تم اور کتنی وارداتوں میں ملوث رہے ہو؟“

”کسی میں بھی نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

محمود علی نے اس گفتگو کو ریکارڈ کرنے کا بندوبست کر لیا تھا لیکن باسط اس بات سے بے خبر تھا۔ اس کے باوجود اس نے براہ راست کسی بات کا اقرار نہیں کیا اور گول مول انداز میں جواب دیتا رہا۔

محمود علی نے اس پر دباؤ نہیں ڈالا۔ آخر میں اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی ہمارے پاس دو ہفتے ہیں عدالت میں چالان پیش کرنے کے لئے اس لئے ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔“ یہ کہہ کر محمود علی گھر کے لئے رخصت ہوگیا۔

وہ صبح و شام بلکہ دن میں کئی بار باسط سے ملتا تھا، اس سے گھما پھرا کر سوال کرتا تھا۔ پہلے تو باسط کا اعتماد برقرار رہا تھا لیکن جلد اس کے انداز میں جھنجھلاہٹ سی آنے لگی تھی۔

رقیہ کے اعصاب اس سے پہلے جواب دے گئے تھے اور اس نے خاص خاص باتیں اگل دی تھیں لیکن اصل اہمیت باسط کی تھی۔ ان جرائم کے پس پشت اس کا دماغ کام کر رہا تھا اور وہی اصل مجرم بھی تھا۔ محمود علی نفسیاتی حربے استعمال کر کے اس کو کمزور کر رہا تھا۔

اس دوران اس نے عذرا خاتون اور ظفر عباس کو بلوا کر ان لوگوں کی شناخت کرائی۔ دونوں فریقوں نے فوراً باسط اور رقیہ کو شناخت کر لیا تھا۔ راحیل کی تصویر دیکھ کر انہوں نے تصدیق کی تھی کہ یہ وہی شخص ہے جو ان کی بیٹیوں کا شوہر بنا تھا لیکن وہ اس معاملے میں زیادہ پرجوش نہیں تھے۔ یہ گویا مدعی سست اور گواہ چست والی بات تھی۔

محمود علی نے تمام ثبوت اور شہادتیں بھی ان کے سامنے رکھی تھیں لیکن باسط کو جس چیز نے سب سے زیادہ توڑا تھا، وہ اس کی بیوی کی جانب سے کئے گئے اعترافات تھے۔ اس روز محمود علی نے باسط سے ملاقات کی تو اس کی حالت تباہ لگ رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ اس نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ ذرا سی دیر میں اس کی تصدیق ہوگئی جب اس نے تھکے ہوئے انداز میں التجا کی۔ ”خدا کے لئے یہ سلسلہ اب بند کرو...... بولو تم مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو؟“

”باسط! میرا اندازہ ہے کہ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔“ محمود علی نے اس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”پھر تم اس گھناؤنے جرم کی طرف کیسے آئے؟“

”میں نے وہی اس معاشرے کو لوٹایا جو اس نے مجھے دیا تھا۔“ باسط کے لہجے میں بے حد تلخی تھی۔ ”تمہارا اندازہ درست ہے، میں تعلیم یافتہ شخص ہوں، ایک اسکول میں پڑھاتا تھا، میری اور میری بیوی کی ایک ہی اولاد تھی، ہماری ایک بچی......! جسے ہم نے ساری چاہتیں دی تھیں، سارے خواب اس کے لئے دیکھے تھے لیکن ان خوابوں کی تعبیر انتہائی بھیانک نکلی جب وہ جوان ہوئی اور ہم نے اس کی شادی کرنا چاہی تو پتا چلا اس معاشرے میں کسی کو ایک ٹیچر کی پڑھی لکھی اور سلیقہ شعار، خوبصورت لڑکی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ہمارے پاس اتنی دولت نہیں تھی کہ اسے ڈھیروں جہیز دے سکیں، کئی رشتے آئے لیکن وہ معیار سے اتنے کم تھے کہ ہم نے فوراً انکار کر دیا، پھر ایک رشتہ آیا، لڑکا اکیلا تھا، آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، کھاتا پیتا اور خوش شکل تھا، ہم نے اپنی پھول سی بچی اس سے بیاہ دی اور جانتے ہو اس کا کیا انجام ہوا......؟ ایک مہینے بعد وہ ہماری بچی کو لے کر غائب ہوگیا، ہم نے دیوانہ وار اسے تلاش کیا، تھانے کے چکر لگاتے رہے لیکن ہماری گڑیا نہیں ملی اور جب چھ مہینے بعد ملی تو اس حال میں تھی کہ اس کے جسم سے توانائی کا ایک ایک قطرہ کشید کر لیا گیا تھا، وہ نہ جانے کتنے ہاتھوں سے گزری تھی، اسے بے شمار مہلک بیماریاں لگ گئی تھیں، وہ صرف ایک ہفتہ زندہ رہی تھی اور جب وہ مری تو میں نے ایک عہد کیا ایسے لوگ جن کے پاس دولت ہوتی ہے اور وہ دولت کے بل پر اپنی بیٹیوں کے لئے داماد خریدتے ہیں، انہیں دھوکا دوں گا، انہیں لوٹوں گا اور انہیں چرکے لگاؤں گا کیونکہ یہی لوگ ہیں جو اس معاشرے میں جہیز کی گندگی پھیلا رہے ہیں، ان کی تقلید میں وہ ماں، باپ بھی مجبور ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا، اگر وہ اپنی بیٹیوں کے لئے کچھ نہ کرسکیں تو پھر ان کے لئے ایسے ہی رشتے آتے ہیں جو ان کی بیٹیوں کو کسی جہنم میں لے جاتے ہیں۔“ پروفیسر یکدم چلانے لگا تھا۔ ”یہ آگ تھی جو اس معاشرے نے میرے اندر اتاری تھی اور یہی آگ میں اسے واپس کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

محمود علی نے تاسف سے اسے دیکھا۔ ”لیکن ان دو معصوم لڑکیوں کا کیا قصور تھا جن کو تم نے بے آبرو کیا تھا؟“

اس نے روتے روتے سر اٹھایا۔ ”تم بتا سکتے ہو میری معصوم سی گڑیا کا کیا قصور تھا، اسے کس بات کی سزا ملی، میں نے کہا نا...... جو اس معاشرے نے مجھے دیا، میں نے وہی اسے واپس کیا۔“

محمود علی جانتا تھا کہ عدالت میں اس کے اقبالی بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی، اصل کام گواہیاں اور واقعاتی شہادتیں کریں گی اور وہ ان پر توجہ دے رہا تھا۔

اس نے ایک قابل وکیل کے ساتھ مل کر چالان تیار کیا تھا اور اس میں ایسی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی جس سے پروفیسر کو کوئی فائدہ ہو۔ یہ کام اس کے لئے زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ واقعاتی شہادتیں بے شمار تھیں لیکن سب سے زیادہ مشکل اسے گواہی کے سلسلے میں پیش آئی جن کے ساتھ ظلم ہوا تھا، وہ آگے آنے سے ہچکچا رہے تھے اور دوسرے لوگ بھی گواہی دینے سے کترا رہے تھے۔

دسمبر کے پہلے ہفتے میں اس نے چالان بنا کر عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ سیشن کورٹ نے مقدمے کو جانچ کر آگے ریفر کر دیا، سرکاری وکیل بابر اس معاملے میں سرگرمی سے کام کر رہا تھا، اس کی مدد سے محمود علی نے مقدمے کو بے نقص بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ دونوں مطمئن تھے کہ شفیع الرحمٰن اور اس کی بیوی کو عدالت سے سخت سزا ملے گی۔ تین مہینے کی مسلسل سماعت کے بعد عدالت نے شفیع الرحمٰن کو تا عمر قید سخت کی سزا سنائی اور اس کی بیوی کو سات سال کی سزا ہوئی۔ شفیع الرحمٰن کی جائداد اور دولت بھی ضبط کر کے اس سے مظلوم خاندانوں کو ہرجانہ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

(ختم شد)